سلسلہ اشاعت امامیہ مشن، لکھنؤ ۱۲

# تاریخ اسلام

(دوسرا ایڈیشن)

(مصنفہ)

حضرت سید العلماء مولانا سید علی نقی صاحب قبلہ مدظلہ

قیمت ۹ر　　　　محصول ۱ر

20,070

## امامیہ مشن لکھنؤ کی بارھویں دینی خدمت

# اسلام اور تجارت

حضرات، یہ رسالہ جو آپ کے پیش نظر ہے درحقیقت اُن چار معرکہ آرا تقریروں کا خلاصہ ہے جو حضرت سید العلماء دام ظلہ نے "امراض قومی اور اُنکا علاج" کے موضوع پر مدرستہ الواعظین کے بیرونی وسیع میدان میں بتاریخ ۱۳، ۱۴، ۱۵، ۱۶، محرم الحرام ۱۳۵۲ھ فرمائی تھیں اور افراد قوم کی ذہنیت میں نمایاں انقلاب اور عملی نتائج پیدا کرنے میں کامیاب ثابت ہوئیں، اس کے بعد یہ مسلسل طور پر معزز اخبار سرفراز کی ۹ اشاعتوں میں شایع ہوئیں اور پھر بیرونی حضرات کے بذریعہ خطوط توجہ دہانی اور نیز ضرورت وقت کے احساس کی بنا پر ربیع الثانی ۱۳۵۲ھ میں مشن نے اُن کو رسالہ کی صورت میں شایع کیا، عرصہ سے یہ کتاب ختم ہو چکی تھی اب موجودہ زمانہ کے حالات اور بالخصوص زمینداری ضبط ہونے کے نتیجہ میں جو کشاکش حیات درپیش ہے اُس میں فوری رہنمائی کے لیے اس رسالہ کو دوبارہ شایع کیا جاتا ہے اُمید ہے کہ افراد قوم اس کو کثیر سے کثیر تعداد میں خرید فرما کر خود ملاحظہ کریں گے اور اپنے احباب کو اُس کے مضامین پر مطلع فرمائیں گے اور اُن کو عملی اقدام اور جدوجہد پر آمادہ کریں گے جو ان بیانات کا حقیقی مقصد تھا۔ والسلام

خادم ملت سید ابن حسین نقوی
سکریٹری امامیہ مشن
لکھنؤ

ربیع الثانی ۱۳۷۵ھ
دسمبر ۱۹۵۵ء

۲۰۳ تجارت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ۝

الحمد للہ وکفٰے وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰے

# تمہید

## امراض قومی اور ان کا علاج.

دوائک فیک ولاتبصر ودائک منک ولاتشعر

وتزعم انک جرم صغیر وفیک انطوی العالم الاکبر

نور وظلمت، سیاہی اور سفیدی۔ حرارت و برودت کی طرح صحت اور مرض دو متضاد حالتیں ہیں۔

ایک ذی روح کے جسم کا حد اعتدال میں ہونا ہر قوت کا اپنے پیمانہ پر کام کرنا اور ہر پرزہ کا ٹھیک طور سے مصروف عمل ہونا صحت ہے اور اسی جسم کا اپنے مزاج فطری سے ہٹ جانا۔ کسی قوت کے کام میں نقصان پیدا ہو جانا۔ کسی پرزہ کا معطل ہو جانا یا کم از کم اپنے کام کو ٹھیک طور پر انجام نہ دینا مرض ہے۔

مرض کا علاج اگر شروع ہی شروع میں کر لیا جائے تو اکثر اُس کا برطرف ہو جانا آسان ہوتا ہے۔ لیکن جب مرض دیرپا ہو جائے اور اُس کی

جڑیں طبیعت کے اندر جم جائیں تو پھر اُس کا علاج دشوار ہوتا ہے، یا کبھی غیر ممکن العلاج بنجاتا ہے مگر امراض سب یکساں نہیں ہوتے، بعض ایسے ہوتے ہیں کہ انسان کو خود اس کا بین طریقہ پر احساس ہوجاتا ہے جیسے اٹھا ہوا درد یا ٹپکتا ہوا پھوڑا۔ وہ فطری تکلیف اور وجدانی اذیت جو حاصل ہوتی ہے وہی انسان کو اُس کا پتہ دیدیتی ہے لیکن بہت سے امراض ایسے ہوتے ہیں، جن کا نتیجہ اتنے محسوس طریقہ پر ظاہر نہیں ہوتا کہ انسان فوراً اُس کو سمجھ لے بلکہ اکثر ابتدائی منزل میں کہ جب اُس کا علاج آسان ہے اُس کا اندازہ نہیں ہوتا اور جب وقت خبر ہوتی ہے اُس وقت وہ قابل علاج ہونے کی حد سے گذر چکتا ہے اور علاج اُس کا دشوار یا ناممکن بن چکا ہوتا ہے۔ جیسے دق کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اگر پہلے درجہ میں اُس کی اطلاع ہوجائے تو فوراً علاج آسان ہے اور اگر دوسرے درجہ میں خبر ہو تو علاج مشکل ہے اور تیسرے درجہ میں انتہائی مشکل لیکن افسوس ہے کہ اس مرض کا احساس اکثر اُسی وقت ہوا کرتا ہے کہ جب وہ دوسرے یا تیسرے درجہ کی حد تک پہونچ چکا ہے اُس وقت خبر بھی ہوئی تو کیا فائدہ اس لیے کہ علاج کا وقت گذر چکا ہوتا ہے، اس کے لیے بے شک ضرورت اسی بات کی ہے کہ انسان ماہر ترین اطبار کی طرف رجوع کرکے اپنی جانچ کرائے اور اُن کے ہدایات پر عمل کرے اور اس کے لیے ضروری امر ہے کہ اگر طبیب اُس کی بیماری کا احساس کرکے حکم لگا دے کہ وہ

بیمار ہے تو یہ اُس کے قول کو اپنے ذاتی خیال پر مقدم سمجھ کر علاج میں مصروف ہو جائے اس وقت کامیابی کی توقع ہے۔ لیکن اگر طبیب کہتا رہا کہ تم بیمار ہو۔ مگر یہ اپنی ظاہری حالت پر ناز کرکے پورے طور سے اس عقیدہ پر قائم رہا کہ میں صحیح وسالم ہوں اور اس لیے علاج کرنے کے بدلے وہ خود طبیب کا مذاق اُڑاتا رہا تو ایسے شخص کے لیے کبھی صحت کی اُمید نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ مرض کے لیے اُس کی جہالت آغوش تربیت ہے اور نشو ونما کے ساتھ حد کمال پر پہونچنے کے بعد اُس کا استیصال طاقت بشری سے باہر نتیجہ کیا ہے ؟ وہی ایک یعنی ہلاکت۔

افسوس ہے کہ اس وقت قوم کے امراض کی نوعیت یہی ہے۔ قوم بحالت موجودہ مریض ہے اور انتہائی مریض لیکن اُس کو اپنے مرض کا احساس نہیں رہا اگر کوئی طبیعت شناس ناصح بتلانا بھی چاہے کہ وہ بیمار ہے تو کیا فائدہ جبکہ وہ یقین کرنے پر تیار نہیں لیکن پھر بھی یہ فرض عائد یقیناً ہوتا ہے کہ نبض شناس فرد قوم نے جب مرض کا احساس کرلیا تو وہ اپنے خیالات کا اظہار ضرور کردے، اُس پر توجہ ہونا اور نہ ہونا دوسرا امر ہے۔

اکثر اوقات کسی خاص تغیر کا احساس اس وجہ سے نہیں ہوتا کہ اُس کی رفتار تدریجی حیثیت سے زمانہ کے امتداد کے ساتھ تھی اور انسانی طبیعت پر بھی برابر اُسی رفتار زمانہ کی پابند۔

دھوپ پر آنکھ جمائے رہنے والا کبھی اس کا احساس نہ کرے گا کہ وہ متحرک ہے بلکہ وہ دیکھنے میں اُس کو ایک ہی جگہ پر قائم سمجھے گا۔ حالانکہ اُس کی رفتار کا سلسلہ جاری ہے۔ بے شک اگر سو گیا اُس وقت کہ جب دھوپ مغربی دیوار کے گوشہ سے متصل تھی اور بیدار ہوا اُس وقت کہ جب وہ مشرقی دیوار تک پہونچ چکی تو اُس وقت اُسے احساس ہوگا کہ دھوپ نے کس قدر راستہ قطع کیا۔

بس اسی صورت سے قوم کا تنزل چونکہ تدریجی حیثیت سے ہے اور زمانہ کی رفتار کے ساتھ ساتھ، اور افراد قوم اُسی زمانہ کی رفتار میں زندگی کی منزلیں قطع کرنے والے، لہذا اُنھیں بیّن طریقہ پر اپنے حالات کے انقلاب کا اندازہ نہیں ہوتا۔ اس کی صورت یہی ہے کہ درمیانی کڑیاں نظر انداز ہوں تاریخ نے سابقہ حالات کا فوٹو اپنے اندر الفاظ کی صورت میں محفوظ کر لیا ہے۔ اُس کے اوراق کو اُلٹ کر آج سے پچاس برس، دو سو برس اور اسی طرح آگے بڑھ بڑھ کر موجودہ پیش نظر حالت کے ساتھ اُس کا تقابل کرتے جائیے تو معلوم ہو کہ ہم کیا تھے اور کیا ہو گئے۔

ہم ایک وقت میں عظمت و اقتدار کے مالک تھے۔ ہمارے نام کا سکہ دنیا میں چل رہا تھا، ہمارے سامنے دنیا سر تسلیم خم کئے ہوئے تھی، ہمارے اخلاق دنیا کے لیے سبق آموز تھے، ہمارے تعلیمات دنیا کے معلم تھے۔ ہمارے قدم سب سے آگے تھے اور ہم دنیا کے رہنما

و مقتدا و پیشوا تھے، لیکن اب کیا ہوا؟ اب یہ ہوا کہ ہم سب کے پیچھے ہیں اور دنیا ہم سے آگے، ہمارے عظمت و اقتدار کا قلعہ نیست و نابود ہو چکا ہے، ہماری بنیادیں متزلزل ہیں، ہمارے شعائر پامال ہیں، ہمارے مقاصد پیوند خاک ہیں۔ ہم دنیا میں ذلت کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور دنیا کے ذلیل ترین اقوام ہم سے بلند سمجھے جاتے ہیں آخر یہ کیا ہوا؟ کدھر گئی ہماری عظمت اور کہاں گیا ہمارا اقتدار اور کیا ہوا ہمارا وقار؟ بے شک بتلا دیا ہے اُسی خدا نے جو عزت کا اصلی مالک ہے۔ ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم خدا تغیر و تبدل نہیں پیدا کرتا کسی قوم میں جب تک کہ وہ قوم اپنے نفسانی حالات میں تغیر پیدا نہ کر دے۔

دوسری آیت ذلک بان اللہ لم یک مغیرا نعمۃ انعمھا علی قوم حتی یغیروا ما بانفسھم۔

بات یہ ہے کہ خدا کسی اُس نعمت کو جو کسی قوم کو عطا کی ہے اُس وقت تک سلب نہیں کرتا جب تک وہ خود اپنے حالات میں تغیر پیدا نہ کر دے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ اگر ہمارے قومی حالات میں تغیر پیدا ہوا ہے تو اُس کے اسباب کی تلاش ہم کو خود اپنے ہی اندر کر لینا چاہیے اور لسان قدرت کے بزرگ ترین ترجمان امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اپنے دونوں شعروں میں جو میرے اس بیان کا سرنامہ ہیں اسی کو ارشاد فرمایا ہے۔

"بیشک تمھاری دوا خود تمھیں میں موجود ہے لیکن تم آنکھ کھول کر دیکھتے نہیں اور مرض کا اصلی منشا خود تمھارے ہی اندر ہے۔ لیکن تم کو احساس نہیں تم سمجھتے ہو کہ ہماری ہستی ایک مختصر جسم میں محدود ہے حالانکہ تم میں حقائق و اسرار کا بہت بڑا عالم مضمر ہے۔

بیشک مرض کی تشخیص سب سے پہلی اور بہت بڑی کامیابی ہے۔ پھر اُس مرض کے اسباب کی تلاش دوسری منزل ہے اور اُس کے بعد اُن اسباب کے استیصال کی فکر اور مرض کے علاج کی کوشش آخری نتیجہ ہے۔

# قوم کا پہلا مرض اور اُس کا علاج

## درآمد و برآمد کا عدم توازن

انسان کا دورِ زندگی تین حصوں میں منقسم ہے سن نشو و نما، سن وقوف اور سنِ انحطاط اس لئے کہ قدرت نے اُس کے نظام زندگی کو تجدد و تغیر پر مبنی قرار دیا ہے اور اُس کی بقار کو غذائے خارجی کا پابند۔ اُس کے جسمانی اجزار زمانہ کی رفتار کے ساتھ تحلیل ہوتے رہتے ہیں لیکن غذا کہ جو جسم میں پہونچتی ہے اُس کا لب لباب اور جوہر لطیف انسان کا جزو بدن ہو کر تحلیل شدہ اجزار کی قائم مقامی کرتا ہے اور اسی بدل ما تحلیل کی بدولت انسان کا نظام حیات قائم رہتا ہے۔ ابتدائی دور میں جتنے اجزار جسم کے تحلیل ہوتے ہیں اُس سے زیادہ مقدار غذا کی اُس کا جزو بدن ہوتی ہے اس لئے اُس کا جسم ترقی کرتا رہتا ہے اور روز بروز قوت و طاقت میں اُس کی اضافہ ہوتا ہے۔ یہاں تک کہ وہ ایک کامل جوان کی حد تک پہونچتا ہے جو ترقی کی آخری منزل ہے۔ اب شروع ہوا سن وقوف اس میں جتنی قوت انسان کے جسم سے تحلیل کی بدولت جاتی ہے۔ اُتنی ہی بدل کی صورت میں انسان کے جسم میں آجاتی ہے، اس کا نتیجہ ہے کہ اُس کی حالت میں نہ زیادتی ہو اور نہ کمی بلکہ وہ ایک حالت پر ٹھہرا رہے اس کے بعد شروع ہوتا ہے تیسرا دور جس کا نام ہے سن انحطاط، یہ

وہ ہے کہ جس میں انسان کے جسم سے تحلیل زیادہ ہو اور بدل کی صورت میں پیدا کم ہو۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان روز بروز کمزور ہوتا جائے اور اس کی قوتیں مضمحل ہوتی جائیں، اُسی کا انجام ہے موت جس کا دوسرا نام ہے فنا۔

بس اسی اصول کے مطابق اگر آپ کو کسی قوم کے دور ترقی دور قوت، دور تنزل کا پتہ لگانا ہو تو یہ دیکھئے کہ اس قوم سے دوسروں کے پاس کتنا جاتا ہے اور دوسرے اقوام سے اُس کے پاس کتنا آتا ہے۔

اگر آپ نے دیکھا کہ جتنا اس کے ہاتھوں سے دوسروں کے پاس جاتا ہے اُس سے زیادہ دوسروں کے پاس سے اُس کے پاس آجاتا ہے۔ تو یقیناً یہ قوم ترقی کر رہی ہے اور اُس کی طاقت و قوت میں روز بروز افزونی ہی ہوگی اور اگر ایسا ہے کہ بس جس قدر دوسروں کے پاس سے اُس کے پاس آتا ہے۔ اُتنا ہی اُس کے پاس سے دوسروں کے پاس چلا جاتا ہے تو پھر غنیمت ہے۔ سمجھئے کہ قوم ایک حالت پہ قائم ہے۔ اُس کے لئے اس صورت میں نہ ترقی ہوگی نہ تنزل لیکن اگر کہیں ایسا ہوا کہ جتنا دوسروں کے پاس سے آتا ہے۔ اُس سے زیادہ اُس کے پاس سے دوسروں کے ہاتھ میں چلا جاتا ہے، تو سمجھئے کہ یہ ہے دور تنزل اس کا نتیجہ ہے کہ روز بروز ناتوانی و کمزوری میں اضافہ ہو۔ اور آخری انجام یہ ہے کہ وہ قوم صفحہ ہستی سے فنا ہو جائے۔

اس معیار کے مطابق جب ہم اپنی قوم کی حالت پر غور کرتے ہیں تو افسوس کی انتہا نہیں رہتی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ غیروں کے پاس جا رہا ہے اور غیروں کے پاس سے ایک حبہ بھی ہمارے پاس نہیں آسکتا۔ ہماری سابقہ دولتیں، موروثی اموال، برسوں کے نہفتہ ذخیرے جائدادیں زمینیں سب دوسروں کے پاس پہونچ گئیں۔ لیکن ہمارے ہاتھ میں کیا آیا؟ کچھ نہیں، اس صورت میں تو اگر خزانۂ قارون بھی ہوتا تو وہ ختم ہو جاتا۔ اور آخر اس میں خاک اڑنے لگتی۔ کنوئیں سے پانی کھینچتے رہیے۔ وہ پایاب رہے گا۔ مگر اس وقت جب تک کہ اس میں سوتے ہیں یعنی جتنا کھینچتے ہیں اتنا آجاتا ہے لیکن اگر اس کے حلقۂ اتصال کو مرکز آب سے قطع کر دیجیے تو یقین سمجھیے کہ وہ بہت جلد خشک ہو گا۔ اس لئے کہ اس میں برآمد کے ساتھ درآمد کا سلسلہ باقی نہیں رہا ہے۔

حیات انسان کی بنیاد دوران خون پر ہے، یہی رگوں میں دوڑتا ہوا خون وہ ہے جس پر نظام زندگی قائم ہے۔ بیشک اس خون کو متحرک رہنا چاہیے۔ اور سیال، نظام زندگی قائم رہے گا لیکن اسی وقت کہ جب تک یہ خون عروق و شرائین کے راستوں سے ہر پھر کر جسم کے اندر رہتا ہے۔ لیکن اگر شہرگ قطع ہو گئی یا ہاتھ کی متحرک نبض کٹ گئی اور یہ خون بہنا شروع ہوا۔ تو یقین جانئے کہ اس کا نتیجہ ہے موت، بس اسی طرح سمجھ لیجیے کہ ایک قوم کی بقائے زندگی اسی وقت ہو سکتی ہے کہ جب تک اس کا سرمایہ ہر پھر کر اسی قوم کے افراد کے پاس رہتا ہے لیکن اگر منتقد ہو گیا۔

سیال کہ جس میں سے یہ سرمایہ نکل نکل کر باہر جانے لگا۔ اور اُس کی کوئی روک نہ ہوئی نہ اُس کا کوئی بدل حاصل ہوا تو یقیناً اُس قوم کا آخری نتیجہ ہے فنا۔ اب دیکھ لیجئے خود کہ آپ کی قوم کی بھی یہی حالت ہے یا نہیں؟

یہ کیوں؟ اس لئے کہ تمام وہ ذرائع واسباب ترک کر دیئے جن سے حصول آمدنی کا امکان ہے۔ اور تمام وہ باتیں اختیار کرلیں جن سے دوسروں کو نفع پہنچنے کا موقع ہے۔ ضروریات زندگی کو اتنا وسیع کیا کہ ہر شئے کی احتیاج زیادہ سے زیادہ ہم کو ہوگئی اور خود اُن ضروریات کے پورا کرنے کا سامان نہ کیا تاکہ ہمارے ضروریات خود ہم ہی سے پورے ہوتے نتیجہ یہ ہوا کہ وقتی ضروریات پورے ہوئے مگر اس طرح کہ ہماری دولت اور غیر کا خزانہ۔

پھر اس کا علاج؟ علاج یہی ہے کہ ایسے ذرایع کو دوبارہ اختیار کرو جن سے تمھارا روپیہ تمھاری ہی جیبوں میں رہے۔ یا اگر دوسروں کے پاس جائے تو دوسرے کے پاس سے بھی اسی تناسب سے تمھارے پاس آجائے۔ تجارت، صنعت وحرفت اور زراعت یہی چیزیں وہ ہیں جن سے قوموں کی زندگی ہوتی ہے اور ان ہی چیزوں کا ترک کرنا وہ تھا کہ جس نے ہماری قوم کو اُس درجہ تنزل تک پہونچایا۔ اب اگر قوم زندہ ہونا چاہے تو ان ہی ذرایع کو پھر اختیار کرنا پڑے گا جو اُس کی زندگی کے باعث ہوں اور اُس کو معراج ترقی تک پہنچانے کے ذمہ دار ہوسکیں۔

# مرض کا سبب اصلی

## افراد قوم کی ذہنیت اور غلط خیالات کی پیداوار

انسان کا طرز عمل حقیقۃً اُس کی ذہنیت کا پابند ہوتا ہے۔ انسان کے اندر عملی کمزوری اکثر اُن خیالات کے تحت میں ہوتی ہے۔ جو اُس کے دل و دماغ میں راسخ ہو گئے ہیں اس لئے جب ہم اس مرض کے متعلق غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت وہ کچھ خیالات کا نتیجہ ہے جو افراد ملت کے دماغ میں غلط طور پر قائم ہو گئے ہیں اور وہ اکثر افراد کے زبان و قلم پر بھی آجایا کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم مختصر طور سے ان خیالات کا جائزہ لے کر اُن کی جانچ کریں گے کہ وہ کہاں تک حقیقت سے مطابق ہیں

## پہلا خیال اور اُس کا دفعیہ

سب سے پہلا خیال یہ ہے کہ اسلام نے ترک دنیا کی تعلیم دی ہے اور طلب دنیا سے منع کیا ہے، دین و دنیا کا اجتماع ممکن نہیں ہے اور اس لئے انسان کو دین کے ساتھ دنیا کا طالب ہونا خیال خام ہے۔ ائمہ معصومین ع نے اپنے اقوال و افعال سے ہمیشہ دنیا طلبی کو ممنوع ثابت کیا ہے اور حضرت امیر المومنین علی ابن ابی طالب علیہ الصلوۃ والسلام نے دنیا کو تین مرتبہ طلاق دیدیا تھا۔ لہذا مسلمانوں کے لیے اپنے اسلامی

احکام کے تحت ہیں مال دنیا کی تحصیل میں کدو کاوش کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ خیال وہ ہے جو اکثر دماغوں میں موجود ہے اور اکثر پڑھے لکھے افراد تک اس غلط فہمی کا شکار ہیں۔ جن میں قدیم و جدید تعلیم یافتہ دونوں ہی داخل ہیں، فرق اتنا ہے کہ قدیم تعلیم یافتہ اس کو مسلمہ طور پر احکام اسلامی کے سامنے سر نیاز خم کرتے ہوئے اپنے طرز عمل کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں، اور جدید تعلیم یافتہ اس کو احکام اسلامی کے خلاف بطور اعتراض پیش کرتے ہوئے "اسلام مانع ترقی ہے" کی آواز بلند کرتے ہیں لیکن اگر صحیح اسلامی تعلیمات کی روشنی میں اس خیال پر نظر کی جائے تو اُس کی کمزوری طشت از بام ہو جائے گی اور معلوم ہوگا کہ وہ واقعیت سے کوسوں دور ہے۔

انسان کے اندر قدرت نے دو جزو ودیعت کیے ہیں، ایک مادہ اور دوسرے روح بے شک یہ دو جزو اُس کی ہستی میں لازم و ملزوم ہیں اور ہر ایک کے لیے ایک خاص حیثیت سے ترقی ہے اور اُس کے کچھ خصوصیات ہیں۔ انسانی افراد کے طرز عمل اور مختلف اقوام کی تعلیمات پر جب نظر کی جاتی ہے۔ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ان دونوں پہلوؤں میں سے کسی ایک کی نگہداشت میں افراط و تفریط کی حدوں میں منقسم ہو گئے ہیں بعض مادیت کے اندر اتنے مستغرق ہوئے کہ انھوں نے روح کے وجود ہی سے انکار کر دیا۔ اور انسان کی ہستی کو اسی جسمانی ترکیب و تالیف میں محدود سمجھ لیا اس لیے اُس کا آخری نقطۂ مقصد جو کچھ قرار پایا وہ مادی خواہشات

کا پورا کرنا اور جسمانی راحت و آرام کے اسباب مہیا کرنا اور بس، اکثر افراد ایسے بھی تھے کہ جو عقیدہ کے اعتبار سے روح کے وجود کے منکر نہیں ہیں لیکن عملی حیثیت سے سوائے مادی خواہشات کے پورا کرنے کے اُن کا کوئی نصب العین نہ رہا۔ اُن کی عمر گذری اپنے طاقت واقتدار کے مظاہرہ، رعب وجلال کا سکہ قائم کرنے، مظلوموں کا گلا کاٹنے، حقوق غصب کرنے اور جس صورت سے ہو اپنے سرمایہ ذاتی اور مفاد شخصی کو تقویت پہونچانے میں اور بس، یہ مادہ پرستی یا مادہ پروری کا نقطۂ افراط ہے جس میں روحانیت بالکل معدوم نظر آتی ہے۔

دوسرا گروہ اپنے مذاق کے مطابق روحانیت کی طرف اتنا متوجہ ہوا کہ اُس نے مادی ضروریات کو بالکل پس پشت ڈالدیا۔ بودھ مذہب اور عیسائی راہبوں کے تعلیمات میں اس عنصر کی کمی نہیں ہے۔ افراد بشر سے تعلقات قطع کرکے آباد شہروں کی سکونت کو چھوڑ کر ویرانہ بسانا اور پہاڑوں کی کھوہوں کے اندر عبادت پروردگار میں مصروف ہو جانا اور ما سوی اللہ سے بخیال خودکسی تعلق کا قائم نہ رکھنا اس تعلیم کے خاص جوہر ہیں، یہ پہلے خیال کے تقابل سے نقطۂ تفریط ہے جس میں مادی ضروریات کو ناقابل اعتنا قرار دینے یا فنا کردینے کی کوشش مضمر ہے اور خالص روحانیت کو ترقی دینے کا خیال مد نظر معلوم ہوتا ہے۔

لیکن یہ کلیہ ہے کہ ہر جذبہ جب تک حد اعتدال میں ہے، حق بجانب ہوگا اور ادھر حد اعتدال سے خارج ہوا اُس کے کمال میں نقص پیدا ہوا۔

مذہب اسلام کی سب سے بڑی خصوصیت جس میں وہ تمام دیگر مذاہب سے ممتاز ہے یہی ہے کہ اُس کے تعلیمات میں حد اعتدال کو ملحوظ رکھا گیا ہے۔ اور ہمیشہ افراط و تفریط کے نقطوں کو بچا کر جادہ وسط کی رہنمائی کی گئی ہے اور اسی بنا پر ارشاد کیا گیا تھا کہ جعلناکم امۃ وسطا "ہم نے تم کو امت وسط یعنی جمعیت عادلہ قرار دیا" بے شک نقطۂ وسط ہی وہ ہوتا ہے۔ جہاں آگے بڑھ جانے والوں کو پیچھے واپس آنا اور پیچھے رہنے والوں کو بڑھ کر پہونچنا لازم ہے۔

اصل منزل سے پیچھے رہجانے والا جس طرح منزل سے ابھی دور ہے اسی طرح منزل کو چھوڑ کر آگے بڑھجانے والا، اگر اپنے سلسلۂ رفتار کو جاری رکھے تو منزل سے دور ہی ہوتا جائے گا' ایک خاص شہر کے ارادہ سے ریل پر بیٹھنے والا جس طرح اس کا دھیان رکھے کہ وہ اُس منزل سے پہلے کسی دوسرے اسٹیشن پر نہ اُتر پڑے ویسے ہی اس کا خیال بھی رکھے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ سوتا رہے اور اسٹیشن پیچھے ہی چھوٹ جائے، دونوں صورتوں میں نتیجہ ایک ہے اور وہ شخص منزل پر پہنچنے سے محروم۔ اسلام نے اس مادیت و روحانیت کے مسئلہ میں بھی حد اعتدال کو ملحوظ رکھا ہے اُس نے جس طرح مادیت پرستی کو پامال کیا اور خالص مادیت کی بنیادوں کو ملیامیٹ کیا ہے اُسی طرح اُس کو یہ بھی منظور نہ تھا کہ اُس مادی زندگی سے بالکل آنکھیں ہی بند کر لو اور اپنے جسمانی زندگی کے ضروریات کو بالکل تج ہی دو۔

اگر اُسے اس مادی زندگی سے کنارہ کشی جائز قرار دینا ہوتی تو وہ خودکشی کو حرام قرار نہ دیتا اس لئے کہ اُس میں تو حقیقی معنی میں روح کو اس جسمانی قید سے آزاد کرنے کا نتیجہ حاصل ہوتا ہے لیکن اُس نے لا تلقوا بایدیکم الی التھلکہ کہکر خودکشی کو ایک جرم قرار دیدیا اور حفاظت نفس کو انسان کا فریضہ لازمہ بنایا اُس نے لا رھبانیۃ فی الاسلام کہکر اس نام نہاد روحانیت پرستی کا خاتمہ کر دیا جو اسلام کے علاوہ دوسرے مذاہب میں رائج تھی اور جو نظام اجتماعی و تمدنی کے لیے سم قاتل کا حکم رکھتی تھی۔

اُس نے دنیا و آخرت کے درمیان کوئی ایسی سد محکم قرار نہیں دی ہے۔ کہ جس کا توڑنا ممکن نہ ہو بلکہ اُس نے ان دونوں کو لازم و ملزوم، دست و گریبان قرار دیکر چاہا ہے کہ وہ دونوں اس طرح سمو جائیں کہ دنیا دنیا اور آخرت آخرت نہ رہے بلکہ دنیا بھی تمہید آخرت بن کر منزل آخرت قرار پا جائے۔ یہی معنی ہیں قول جناب رسالتمآب کے الدنیا مزرعۃ الآخرۃ، دنیا آخرت کے لیے کھیتی کی مثال ہے، جس طرح انسان کھیتی کر کے اس کے ثمر کو حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح انسان دنیا کی آلایش اس طرح کرے کہ اُس کا نتیجہ خیر آخرت میں حاصل ہو۔

یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ دنیا کو آخرت کے منافی سمجھکر اُس سے بالکل کنارہ کشی اختیار کرے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ اپنے نفس پر قابو اور اپنے ضمیر پر اقتدار نہیں رکھتا۔ وہ دنیا دی اسباب زندگی کو اس طرح صرف کرنا نہیں جانتا کہ اُن سے آخرت کی منزل حاصل ہو سکے۔ اسلامی کتاب معجز

اور فرمان محکم قرآن مجید کی تعلیم تو یہ ہے " ربنا اتنا فی الدنیا حسنة وفی الآخرة حسنة " خداوندا ہم کو دنیا میں اپنی ایک نعمت عطا کر اور آخرت میں ایک " اور پھر صریحی طور سے ارشاد کیا کہ " ولا تنس نصیبك من الدنیا یعنی تمہارا دنیا میں حصہ موجود ہے کہ اُس کو بھول نہ جانا ، اور رہنمایان مذہب کی آوازیں ہیں کہ دنیا کو بالکل ترک کر دینا غلطی ہے ۔ رسول ص کے بعد دنیائے اسلام کے سب سے بڑے معلم روحانی امیرالمومنین ع نے فرمایا ہے ۔ اُس وقت جبکہ علاء بن زیاد نے اپنے بھائی عاصم بن زیاد کی شکایت کی کہ اُس نے لباس تصوف پہن کر دنیا سے بالکل علیحدگی اختیار کر لی ہے ۔ حضرت نے فرمایا کہ اُس کو میرے پاس لاؤ چنانچہ وہ شخص حضرت کی خدمت میں حاضر کیا گیا ۔ آپ نے نہایت تہدید آمیز الفاظ سے فرمایا یا عدی نفسہ لقد استہام بك الخبیث اما رحمت اھلك وولدك اتری اللہ احل لك الطیبات وھو یکرہ ان تاخذ ھا " اے اپنے نفس کے دشمن حقیقت یہ ہے کہ شیطان نے تجھ کو بہکا دیا ہے ۔ ارے تو نے اپنے اہل وعیال اور اولاد کا بھی خیال نہ کیا ۔ کیا تو سمجھتا ہے کہ خدا نے طیبات کو حلال تو کر دیا ہے ۔ لیکن تیرا استعمال کرنا ان طیبات کو اُسے ناگوار گذریگا ؟ ہرگز ایسا نہیں ہے ۔

پیغمبر اسلام حضرت ختمی مرتبت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صریحی طور پر فرمایا ، لیس خیرکم من ترك الدنیا لآخرتہ ولا آخرتہ لدنیاہ بل خیرکم من اخذ من ھذہ وھذہ " تم میں سے وہ شخص قابل تعریف

نہیں ہے جو دنیا کو آخرت کے لیے چھوڑ بیٹھے، اور نہ وہ جو آخرت کو دنیا کے لیے ترک کر دے۔ بلکہ اچھا وہ شخص ہے جو دنیا و آخرت دونوں میں حصہ لے "

اسلام نے بیشک ترک دنیا کی تعلیم دی ہے لیکن وہ دنیا جو اپنے مفہوم کے اعتبار سے آخرت سے جداگانہ ہے جس کی مختصر شناخت یہ ہے کہ انسان اپنے ذاتی و شخصی مفاد کی خاطر آئینی و غیر آئینی ہر قسم کے طرز عمل پر تیار ہو جائے، سرمایۂ شخصی میں اضافہ کر کے اپنے افراد قوم پر بیجا تفوق کا مظاہرہ کرے اور اپنے غرور و نخوت سے سر کو بلند کرے۔ بیشک یہ سرمایہ داری وہ ہے کہ جس کو اسلام نے نفرت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ وہ اگرچہ اشتراکیت کا حامی نہیں ہے اور اس راستہ کی رہنمائی نہیں کرتا جس پر اس وقت روس قدم زن ہے لیکن پھر بھی اس نے ایک حد تک اغنیا کے اموال میں فقراء کو شریک قرار دیا ہے یعنی فرض مذہبی کی حیثیت سے ان اغنیاء پر ان کی اعانت و دستگیری کا حق عائد کر دیا ہے اور ایک مخصوص مقدار ان پر واجب الادا قرار دی ہے جس کا ادا کرنا ان کا فرض ہے اور اس طرح اس کے ادا کرنے پر ان کو فقراء کے اوپر کسی احسان جتانے اور منت رکھنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔ اس لیے کہ وہ تو ان کے حق کو ادا کر رہے ہیں۔ کچھ بلا استحقاق اپنی جیب سے ان کو عطا نہیں کر رہے ہیں اس طرح اسلام نے چاہا تھا کہ مسلمانوں کی دولت اجتماعی حیثیت سے افراد قوم کی شیرازہ بندی میں صرف ہو اور انفرادی ترقی و اجتماعی ترقی کے ساتھ توام ہے

لیکن افسوس ہے کہ ایک طرف اغنیائے ملت نے اپنے فرض کو ادا

نہ کیا، امانت خدا کو جو درحقیقت اُن کے ہاتھوں میں ودیعت رکھی گئی تھی۔ اپنا ذاتی واستحقاقی مال سمجھکر اُس کو اپنے خزانوں میں محفوظ کیا دوسری طرف قوم کی اکثریت نے ترک دنیا کے اسلامی احکام کو غلط انداز نگاہ سے دیکھکر یہ سمجھ لیا کہ کسب معیشت اور سرمایہ کی جمع آوری میں کسی قسم کی جد وجہد کرنا نفرت انگیز ہے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ قوم میں مجموعی حیثیت سے نکبت وافلاس نے خیمے ڈالدیئے اور وہ دنیا کے تمام اقوام سے زیادہ بے مایہ وتہیدست نظر آنے لگے حالانکہ اسلام کسب معیشت اور ذاتی محنت سے مال حاصل کرنے کو بُری نظر سے دیکھنے اُس نے تو کسب معاش کو مذہبی حیثیت سے اتنی اہمیت دی کہ ارشاد ہوا طلب الحلال جہاد " مال حلال کو حاصل کرنا جہاد کا درجہ رکھتا ہے" کبھی ارشاد ہوا افضل الاعمال الکسب الحلال " بہترین اعمال کسب حلال ہے"

امام محمد باقر علیہ السلام کی حدیث ہے کہ رسالتمآب نے فرمایا العبادۃ سبعون جزأ افضلها طلب الحلال " عبادت کے ستر جزو ہیں۔ جن میں سب سے افضل کسب حلال ہے۔

کہاں ہیں عبادت کے مفہوم پر پابندی عائد کرنے والے اور اُس کی وسعت کو تنگ بناکر اُس کو صرف نماز روزہ حج وزیارت میں محدود بنانے والے دیکھیں اس حدیث کو اور سمجھیں کہ اسلام شخصی عبادات کے ساتھ اجتماعی مفاد کی ترقی اور نظام زندگی کی شیرازہ بندی کو کس طرح

عبادت کا ایک اہم جزو قرار دے کر اُس کا حکم دے رہا ہے۔

اور ملاحظہ ہو کان رسول اللہ جالساً مع اصحابہ فنظروا الی شاب ذی جلد وقوۃ وقد بکر یسعیٰ فقالوا ویح ھذا لو کان شبابہ وجلدہ فی سبیل اللہ ایک روز رسالتمآبؐ حلقہ اصحاب میں بیٹھے ہوئے تھے، اصحاب کی نظر ایک جوان توانا وتندرست اور طاقتور پر پڑی جو صبح سویرے طلب معاش میں گھر سے باہر نکلا تھا۔ اصحاب نے کہا کہ افسوس اس کی جوانی وطاقت جسمانی خدا کی راہ میں صرف ہوتی تو کتنا اچھا تھا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت نے فرمایا کہ لاتقولوا ھذا فانہ ان کان یسعیٰ علی نفسہ لیکفھا عن المسئلۃ ویغنیھا عن الناس فھی فی سبیل اللہ وان کان یسعیٰ علی ابوین ضعیفین او ذریۃ ضعاف فیغنیھم ویکفیھم فھو فی سبیل اللہ وان کان یسعیٰ تکاثرا وتفاخرا فھو فی سبیل الشیطان ۔ ایسا نہ کہو کہ اس لئے کہ اگر یہ اپنے نفس کے لیے جد وجہد کرتا ہو کہ اُسے لوگوں کے سامنے دست سوال دراز کرنے سے محفوظ اور لوگوں سے مستغنی کرے تو وہ حقیقۃً خدا ہی کی راہ میں مصروف ہے اور اگر وہ ضعیف العمر ماں باپ یا کمزور اولاد کے لیے سعی وکوشش کر رہا ہے تاکہ اُنھیں لوگوں سے مستغنی بنائے اور امداد پہونچائے تو بھی خدا کی راہ میں ہے بیشک اگر ذاتی گھمنڈ اور نخوت وغرور کرنے کے لیے جد وجہد کرتا ہو تو وہ شیطان کے راستے پر ہے۔

اس حدیث سے مطلب بالکل صاف ہو گیا۔ اور معلوم ہوا کہ کس طرح

نیت واقعیت اور اُس کے حکم کو بدل دیتی ہے۔ اب اسلام کے ترک دنیا کے احکام کو مطلق کسب معیشت اور طلب حلال پر منطبق کرنا صریحی غلطی نہیں تو کیا ہے۔

اس سب کے ساتھ جب رسالت اور رہنمایان اسلام کے طرز عمل اور سیرت پر نظر کی جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ انھوں نے عملی حیثیت سے اس خیال کے پرخچے اڑا دیے ہیں، سب سے پہلے یہ یاد رکھنا چاہیے کہ رسالتمآبؐ نے نبوت سے پہلے تاجرانہ زندگی اختیار کی اور ایک مرتبہ حضرت ابو طالب کی معیت میں اور دوسری مرتبہ اموال جناب خدیجہ کو لیکر تنہا شام کی جانب تجارت کے لیے تشریف لے گئے اور یہی تجارت وہ تھی جو تمہید بعثت قرار پائی۔ اسی سلسلہ میں حضرت خدیجہ کو آپ کی جانب میلان طبعی پیدا ہوا اور حضرت کی شادی خدیجہ کبریٰ کے ساتھ ہو گئی جس کے بعد اسلام کی ترقی کے لیے مالی دشواریوں کا سوال برطرف ہوا اور حضرت کو تبلیغ اسلام کا حکم ہوا۔ عقیدہ کی بنا پر رسولؐ کا فعل جس طرح بعد بعثت لازم الاتباع ہے اُسی طرح قبل بعثت اس لیے کہ عصمت جو اُن کے طرز عمل کو یقینی طور سے قابل تقلید بنانے کی ذمہ دار ہے۔ وہ اُن کی زندگی کے ہر دور میں موجود تھی۔

جناب رسالتمآبؐ کے بعد ائمہ معصومین علیہم السلام جو آئین شریعت کے حقیقی نگہدار تھے اُنھوں نے برابر اُس طرز عمل کو قائم رکھا وہ کسب معیشت کے سلسلہ میں اپنی ذاتی محنت کے صرف اور کد و کاوش کو اپنے لیے عار و ننگ نہ سمجھتے تھے اور نہ اُسے ترک دنیا کے خلاف تصور کرتے تھے۔ امیر المومنین علی

ابن ابی طالب جن کے متعلق بڑے زور و شور سے پیش کیا جاتا ہے کہ حضرت نے دنیا کو طلاق دیدیا تھا اور واقعہ بھی یہی ہے جس کی نوعیت کی تشریح بعد میں ہوگی آپ کے متعلق امام جعفر صادقؑ کا ارشاد ہے کہ ان امیر المومنینؑ اعتق الف مملوک من کد یدہ " حضرت امیرؑ نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے خرید کر آزاد کیے "

ظاہر ہے کہ ایک ہزار غلاموں کی خریداری کسی معمولی سرمایہ سے نہیں ہوسکتی پھر کیا اب بھی یہ کہا جاسکتا ہے کہ اپنے دست و پا کی کد و کاوش سے سرمایہ حاصل کرنا زہد و تقویٰ اور ترک دنیا کے خلاف ہے۔ امام محمد باقرؑ فرماتے تھے کہ کان امیر المومنینؑ یخرج فی الھاجرۃ فی الحاجۃ قد کفیھا یرید ان یراہ اللہ یتعب نفسہ فی طلب الحلال۔ امیر المومنینؑ اکثر دوپہر کے وقت ایسے کاموں کے لیے نکلتے تھے کہ اگر کسی اور سے فرما دیتے تو وہ ہو جاتے لیکن آپ چاہتے تھے کہ مال حلال کی طلب میں خود زحمت و مشقت اُٹھائیں۔

آپ کے بعد بھی دیگر ائمہ معصومینؑ کی سیرت میں اس قسم کے نمونے موجود ہیں۔ عبد الاعلیٰ مولیٰ آل سام کا بیان ہے کہ ایک شدید گرمی کے دن میں میں نے امام جعفر صادقؑ کو مدینہ کے بعض کوچوں میں دیکھا فقلت جعلت فداک حالک عند اللہ عزوجل وقرابتک من رسول اللہؐ وانت تجھد نفسک فی مثل ھذا الیوم میں نے عرض کیا کہ میری جان آپ پر نثار۔ آپ خدا کی بارگاہ میں جو قرب و منزلت اور رسالتمآبؐ سے جو اختصاص رکھتے ہیں وہ معلوم ہے پھر

باوجود اس کے آپ ایسے گرم وقت میں اتنی زحمت و مشقت اُٹھا رہے ہیں؟ حضرت نے فرمایا یا عبد الاعلی خرجت فی طلب الرزق لاستغنی بہ عن مثلک میں تحصیل معاش کے لیے نکلا ہوں اس غرض سے کہ کسی کا محتاج نہوں" ابو عمرو شیبانی کی روایت ہے رأیت ابا عبد اللہ وبیدہ مسحاۃ وعلیہ ازار غلیظ یعمل فی حائط لہ والعرق یتصاب عن ظہرہ میں نے امام جعفر صادقؑ کو دیکھا حضرت کے ہاتھ میں ایک بیلچہ ہے اور آپ موٹا لباس پہنے ہوئے اپنے ایک باغ میں مصروف کار ہیں اور پسینہ حضرت کی پشت سے ٹپک رہا ہے۔ "فقلت جعلت فداک اعطنی اکفک" میں نے عرض کیا کہ یہ خدمت میرے سپرد ہو۔ میں انجام دیدوں گا" حضرت نے فرمایا انی احب ان یتاذی الرجل بحر الشمس فی طلب المعیشۃ مجھ کو اچھا معلوم ہوتا ہے کہ انسان دھوپ کی ایذا کو برداشت کرے اپنے معاش کی تلاش میں۔

فضل بن ابی حرہ کا بیان دخلنا علی ابی عبد اللہؑ فی حائط فقلنا لہ جعلنا اللہ فداک دعنا نعمل لک او تعملہ الغلمان قال لا دعونی فانی اشتھے ان یرانی اللہ عزوجل اعمل بیدی واطلب الحلال فی اذی نفسی ہم امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے جب حضرت ایک باغ میں مشغول کار تھے ہم نے عرض کی کہ ہم کو اجازت دیجئے ہم اس کام کو کریں یا غلاموں کو حکم دیجئے حضرت نے فرمایا نہیں مجھ کو چھوڑ دو اس لیے کہ میں چاہتا ہوں کہ خداوند عالم

کی نظر مجھ پر پڑے اس حالت میں کہ اپنے ہاتھ سے کام کر رہا ہوں اور اپنے نفس کو ایذا پہونچا کر کسب حلال کرتا ہوں۔"

درحقیقت یہ خیال کہ کسب معاش میں وقت صرف کرنا اور اس سلسلہ میں کد و کاوش کرنا ترک دنیا کے خلاف ہے اور زہد و تقویٰ کے منافی ہے اُس زمانہ میں بھی اکثر سطحی اور ظاہر بیں زہد و تقویٰ کے حقیقی معیار سے ناواقف اور حقیقت کو مجاز میں محدود سمجھنے والے افراد کے دل و دماغ میں موجود تھا اور اس کی صحت پر اتنا اعتماد تھا کہ وہ اس سلسلہ میں امام پر اعتراض کر دینے کو بھی جائز سمجھتے تھے جو اُن کی معرفت کی انتہائی کمزوری کی دلیل ہے چنانچہ میں اس کی بہترین سند محمد بن منکدر کے واقعہ کو سمجھتا ہوں، یہ بزرگ اپنے زمانہ میں مشائخ اہل تصوف اور تارکین دنیا کی حیثیت میں سمجھے جاتے تھے۔ اُن کا خود بیان ہے کہ میں نے محمد بن علیؑ یعنی امام محمد باقرؑ کو دیکھا فاردت ان اعظہ فوعظنی میں نے یہ چاہا کہ حضرت کو موعظہ و نصیحت کروں لیکن نتیجہ میں حضرت نے خود میری ہدایت فرمائی فقال لہ اصحابہ بای شئ وعظک لوگوں نے پوچھا کہ وہ کیا واقعہ ہے؟ کیونکر اُنھوں نے آپ کی ہدایت فرمائی فقال خرجت الی بعض نواحی المدینۃ فی ساعۃ حارۃ فلقانی ابو جعفر محمد بن علی وکان رجلا بادنا ثقیلا وھو متکئ علی غلامین اسودین او مرلیین فقلت فی نفسی سبحان اللہ شیخ من اشیاخ قریش فی ھذہ الساعۃ علی مثل ھذہ الحالۃ فی طلب الدنیا اما

انی لا عظتہ کہا ہیں بعض اطراف مدینہ میں ایک انتہائی گرم وقت میں
کسی ضرورت سے نکلا راستہ میں مجھ کو امام محمد باقر ملے اور حضرت ذرا
تنومند اور جسیم تھے اور اس وقت دو غلاموں کے سہارے سے جا رہے
تھے میں نے اپنے دل میں کہا اللہ اکبر ایک اتنا بڑا بزرگ مرتبہ شخص بزرگان
قریش میں سے اس وقت ایسی حالت میں طلب دنیا میں مصروف ہے،
تو سہی جو میں ان کو اس وقت موعظہ کروں فدنوت منہ فسلمت
علیہ فرد علی بیھر وھو یتصاب عرقا میں حضرت کے قریب گیا
اور سلام کیا حضرت نے جواب سلام دیا اس حالت میں کہ سانس آپ
کی پھولی ہوئی تھی اور پسینہ ٹپک رہا تھا فقلت اصلحک اللہ شیخ من
اشیاخ قریش فی ھذہ الساعۃ علی ھذہ الحالۃ فی طلب الدنیا
ارأیت لو جاء اجلک وانت علی ھذہ الحال میں نے کہا کہ خدا
آپ کے امور کی اصلاح کرے ایک بزرگ مرتبہ آدمی بزرگان قریش میں
سے اور وہ اس وقت ایسی حالت میں دنیا طلبی میں مصروف ہو؟!
غور تو کیجئے اگر ایسی حالت میں آپ کو پیغام موت پہنچ جائے تو کیا ہوگا۔
فقال لو جاءنی الموت وانا علی ھذہ الحال جاءنی وانا فی طاعۃ
من طاعات اللہ عزوجل اکف بھا نفسی وعیالی عنک و
عن الناس وانما کنت اخاف لو جاءنی الموت وانا علی معصیۃ
من معاصی اللہ حضرت نے فرمایا اگر مجھ کو موت آئے اس حالت میں
تو حرج کیا ہے اس لیے کہ اس صورت میں وہ موت مجھ کو آئی ہوگی اطاعت

آئمی میں مصروفیت کے عالم میں جس کے ذریعے سے میں اپنے کو اور اپنے اہل و عیال کو دوسروں سے بے نیاز کرنا چاہتا ہوں، بے شک ڈرتا تو میں اُس وقت جب مجھ کو موت آتی در انحالیکہ میں کسی معصیت میں معاصی الٰہیہ سے مصروف ہوتا فقلت صدقت یرحمک اللہ اردت ان اعظک فوعظتنی میں نے کہا آپ نے سچ فرمایا، میں نے چاہا تھا آپ کو موعظہ کروں حقیقۃً آپ ہی نے مجھ کو ہدایت فرمائی۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ ترک دنیا کا معیار عام نظروں میں کیا تھا اور امام نے اُس کو کس طرح سے غلط ثابت کیا؟

اسی بنا پر برابر اپنے اصحاب کو کسب معیشت کی تاکید فرماتے رہتے تھے اور مخصوص طور سے تجارت کی طرف کہ جو تمام ذرائع کسب معیشت میں اہم درجہ رکھتی ہے توجہ دلاتے رہتے تھے اور دل نشیں الفاظ میں اُس کے فوائد و منافع کو گوش گذار فرماتے تھے چنانچہ امیر المومنینؑ ارشاد فرماتے ہیں تعرضوا للتجارات فان فیھا غنی لکم عما فی ایدی الناس "تجارت کے لیے جد و جہد کرو اس لیے کہ اس صورت میں تم دوسروں کے محتاج نہ رہو گے"

اگر غور کیجئے تو امامؑ نے اس مختصر جملہ میں تجارت کے تمام اقتصادی پہلوؤں پر روشنی ڈال دی ہے اور جہاں تک غور کیا جائے اُس میں بیش از بیش معانی مضمر نظر آتے ہیں۔

فضیل بن یسار کی روایت ہے قلت لابی عبد اللہؑ انی قد

کففت عن التجارۃ و امسکت عنھا قال ولم ذلک اعجزیک کذ لک تذھب اموالکم میں نے امام جعفر صادق ع سے عرض کیا کہ میں نے تجارت سے ہاتھ اُٹھا لیا ہے اور اُس کو ترک کر دیا ہے حضرت نے فرمایا اور یہ کس لیے؟ کیا تم میں کمزوری پائی جاتی ہے؟ اس طرح تو تم لوگوں کے تمام اموال تمھارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔

یہ مختصر فقرہ کہ کذ لک تذھب اموالکم تمام اس بیان کا لب لباب اور جوہر اصلی ہے جس کو میں نے مسلمانوں کے اقتصادی مرض میں طویل بیانات کے ساتھ واضح کیا ہے، وہی درآمد و برآمد کا سوال اور مسلمانوں کے داخلی سرمائیہ حیات یعنی اموال کا غیر اقوام کے پاس پہونچنا اور اس طرح رفتہ رفتہ تمام موروثی و قدیمی نہفتہ و اندوختہ سرمایوں کا ہمارے ہاتھ سے نکل کر دوسروں کے خزانوں میں چلا جانا یہی وہ ہے جس کو امام نے ترک تجارت کے نتیجہ میں ذکر فرمایا ہے۔

ترک تجارت کے مضر نتیجہ میں امامؑ کا یہ ارشاد کہ اس طرح تمھارے اموال ہاتھ سے نکل جائیں گے اس کا قوی ثبوت ہے کہ افراد قوم کے پاس اموال کا ہونا اور دوسرے اقوام سے اموال کا محفوظ رہنا مذہبی تعلیمات کی رو سے قابل لحاظ اور ممدوح و مطلوب ہے اور ترک دنیا کے مفہوم سے اُس کو کوئی تضاد نہیں ہے۔

فضل بن ابی قرہ کی روایت ہے سأل ابو عبد اللہؑ عن رجل وانا حاضر فقال ما جلسہ عن الحج فقیل ترک التجارۃ

وقل شدیۃ قال وکان سکنا فاستوی جالسا ثم قال لھم لاتدعوا التجارۃ فتھونوا اتجروا بارک اللہ لکم امام جعفر صادقؑ نے ایک شخص کے متعلق دریافت فرمایا کہ وہ اب کیوں نہیں آتا۔ کسی نے کہا کہ اُس نے تجارت ترک کر دی ہے اور اُس کا سرمایہ بہت کم ہو گیا ہے، یہ سنا تھا کہ حضرت یا تو تکیہ سے لگے ہوئے بیٹھے تھے اور اور یا سیدھے ہو کر بیٹھ گئے اور فرمایا دیکھو تم کبھی تجارت ترک نہ کرنا ورنہ ذلیل ہو جاؤ گے۔ تجارت کرو خدا برکت عطا فرمائے۔

بیشک عبرت حاصل کرنے کے قابل ہے یہ ارشاد کہ لاتدعوا التجارۃ فتھونوا تجارت نہ چھوڑنا نہیں تو ذلیل ہو جاؤ گے۔

بیشک یہی وہ منظر ہے جس کو ہم آنکھ سے دیکھ رہے ہیں مسلمان اب اقوام عالم کی نظروں میں ذلیل ہیں اور کیوں؟ اسی لیے کہ اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کیا، تجارت کو ترک کر دیا جس پر اُن کی حیات قومی کا دار و مدار تھا۔

اسباط بن سالم کی روایت دخلت علی ابی عبد اللہؑ فسألنا عن عمر بن مسلم ما فعل فقلت صالح ولکنہ قد ترک التجارۃ فقال ابو عبد اللہ عمل الشیطان ثلثا اما علم ان رسول اللہ اشتری عیرا اتت من الشام فاستفضل فیھا ما قضی دینہ وقسم فی قرابتہ یقول اللہ عزوجل رجال لاتلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ الی اخر الایۃ یقول القصاص

ان القوم لم یکونوا یتجرون کذبوا ولکنھم لم یکونوا یدعون الصلوٰۃ فی میقاتھا وھم افضل ممن حضر الصلوٰۃ ولم یتجر۔

میں امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضرت نے ہم سے عمر بن مسلم کے متعلق دریافت فرمایا کہ وہ کیا کرتے ہیں؟ میں نے کہا اچھے ہیں۔ مگر اُنھوں نے تجارت کو ترک کر دیا۔ یہ سُن کر حضرت نے تین مرتبہ فرمایا کہ یہ شیطانی طرز عمل ہے، کیا اُس کو نہیں معلوم کہ رسالت مآب نے شام سے آئے ہوئے مال تجارت کو خرید فرمایا اور اُس میں فروخت کے بعد اتنا نفع حاصل کیا کہ اپنے قرضہ کو ادا کیا اور اپنے اعزہ کی اعانت فرمائی۔ خداوند عالم نے کچھ لوگوں کی مدح کرتے ہوئے ارشاد کیا ہے وہ لوگ ایسے ہیں جن کو تجارت اور بیع ذکر خدا سے غافل نہیں کرتی۔ عام افسانہ گویوں کا خیال ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو تجارت نہ کرتے تھے لیکن یہ بالکل غلط ہے بلکہ یہ لوگ تجارت کرتے تھے اور پھر بھی نماز کو اُس کے اوقات میں ادا کرنے کے پابند تھے اور یہ افضل ہیں اُن لوگوں سے جو نماز میں شریک ہوتے تھے مگر تجارت نہ کرتے تھے۔"

اس حدیث سے جس طرح یہ ظاہر ہے کہ ترک تجارت عمل شیطانی کہنے کا مستحق سمجھا گیا ہے اُسی طرح تجارت میں مشغولیت کی حد افراط و تفریط کا بھی پتہ لگ گیا۔ تجارت میں مصروفیت اس قدر کہ فرائض الٰہیہ میں فروگذاشت ہو اُس کا مذموم پہلو ہے۔ جس طرح تجارت کا ترک کر دینا

اگرچہ عبادات الٰہیہ میں مصروفیت کی جہت سے ہو قابل مدح صفت نہیں، بلکہ انسان تجارت کے ساتھ ساتھ فرائض الٰہیہ کی بجا آوری کا خیال رکھے تو یہ اُس کی کامیابی اور قابل مدح زندگی کہی جاسکتی ہے۔

اب غالباً اس خیال کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ کسب حلال اور طلب معیشت وغیرہ میں مصروفیت ترک دنیا کے خلاف یا زہد و تقویٰ کے منافی ہے لیکن زیادتی اطمینان کے لیے یہ دو حدیثیں بھی نذر ناظرین ہیں جن میں صریحی طور سے زہد کا معیار بتلا دیا گیا ہے۔

ملاحظہ ہو سکونی کی روایت امام جعفر صادقؑ سے قلت لہ ما لزّهد فی الدنیا قال ویحك حرامها فتنكبه" میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ زہد فی الدنیا کے معنی کیا ہیں؟ حضرت نے فرمایا یعنی دنیا کا مال حرام' اُس سے اجتناب کرو۔

دوسری حدیث اسمٰعیل بن مسلم کی روایت قال ابوعبد اللہ لیس الزهد فی الدنیا باضاعة المال ولا تحریم الحلال بل الزهد فی الدنیا ان لاتکون بما فی یدك اوثق منك بما عند الله عز وجل" زہد فی الدنیا کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان خواہ مخواہ مال دنیا کو اپنے ہاتھ سے جانے دے اور حلال کو بھی اپنے اوپر حرام سمجھ لے بلکہ زہد یہ ہے کہ انسان دنیاوی اموال پر اتنا اعتماد نہ کرے کہ آخرت کے معاملہ میں کوتاہی کرنے لگے"!

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کسب حلال اور جائز ذرائع سے طلب معیشت کسی طرح زہد و تقویٰ کے خلاف نہیں ہے اور نہ وہ شریعت اسلامی کے اعتبار سے کسی طرح قابل اعتراض سمجھا جا سکتا ہے۔

# ترک دنیا کا روشن پہلو

## امیر المومنین ع کے ترک دنیا کی نوعیت

## دنیا کو تین مرتبہ طلاق دینے کا صحیح مفہوم

اب تک جو کچھ بھی کہا گیا وہ اس خیال کا دفعیہ تھا کہ انسان کا کسب معاش میں کوشش اور تحصیل مال میں جد و جہد کرنا اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے، ہم نے مکمل طور سے یہ امر پایۂ ثبوت کو پہونچا دیا کہ اسلام ہرگز دنیاوی اموال کی تحصیل اور کسب معاش میں کوشش کو جو جائز طریقوں سے ہو مذموم نظر سے نہیں دیکھتا بلکہ وہ جس طرح انسان کے لیے اپنی اخروی زندگی کے لیے سامان فراہم کرنے کو اہم فرض قرار دیتا ہے اسی طرح اپنی انفرادی و اجتماعی دنیاوی زندگی میں بھی سعی و کوشش کو انسان کے فرائض میں داخل کرتا ہے لیکن اب دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ انسان اموال کی جمع آوری اور ذرائع کسب معاش سے سرمایہ کی فراہمی

کے بعد اُس کو کرے گیا؟ ایک صورت یہ ہے کہ انسان اموال دنیا کو جمع کرے، سرمایۂ شخصی کی فراوانی میں انتہائی جد وجہد صرف کرے، طلا ونقرہ کے انبار لگائے اور زر وجواہر سے خزانے پر کرے لیکن اس کی منفعت اُس کی ذات تک محدود رہے۔ اُس کے جسم پر بہتر سے بہتر لباس ہو، اُس کے دسترخوان پر لذیذ سے لذیذ غذائیں ہوں، اس کے دروازہ پر حشم وخدم ہو، اُس کے گرداگرد خدام وملازمین کا ہجوم ہو اُس کی زندگی خاہانہ اور اُس کا ساز وسامان ملوکانہ ہو اور اُس کے بعد بھی جو کچھ باقی رہے وہ صندوقوں میں مقفل اور خزانے کے بند دروازوں میں محفوظ خیات کے آخری لمحوں تک ہر کس وناکس کی نگاہ سے پوشیدہ ومستور باقی رہے لیکن نہ اُس سے خلق خدا کو کوئی فائدہ ہو، نہ قومی ومذہبی امور پر اُس کے احسانات کا بار پڑے اور نہ کسی غیر تک اس فیض کا اثر پہونچے۔ یہ ہے افسوسناک سرمایہ داری جس میں اکثر وبیشتر ارباب دولت واقتدار مبتلا نظر آتے ہیں۔ ایسے افراد جتنی تعداد میں بھی ہو جائیں کبھی قومی ترقی کا باعث نہیں ہو سکتے۔ اُن کی ترقی ہمیشہ انفرادی ہو گی۔ جس کا قوم کے نظام اجتماعی پر کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ اس کے بالکل برخلاف دوسری صورت یہ ہے کہ انسان اموال کی جمع آوری کرے۔ کسب معاش میں زحمت اُٹھائے لیکن اپنے حاصل کردہ اموال کو صرف اپنی ذات پر صرف کرنے کے بجائے وہ فقراء ومساکین کی خبر گیری کرے۔ قومی ومذہبی کاموں کی انجام دہی کرے۔ اور خیرات وخیرات اوقاف وصدقات کے ذریعہ سے اپنے قومی نظام اجتماعی کے ترقی دینے

میں مصروف رہے۔ اُس کا لباس فقیرانہ ہو اُس کا طعام گدایانہ ہو، اُس کا طرز زندگی محتاجانہ ہو لیکن اُس کے ہاتھوں سے بھوکوں کو کھانا پہونچتا ہو، فقیروں کو لباس ملتا ہو اور محتاجوں کو اُن کی زندگی کا سامان مہیا ہوتا ہو بیشک یہ ہے ترک دنیا کا روشن پہلو جس کی تفسیر یہ ہے کہ انسان دنیا کو اپنی ذات پر صرف نہ کرے۔ مگر اس قدر کہ جو اُس کی زندگی کے لیے کم سے کم مقدار میں ضروری ہو اور باقی سب خلق اللہ کی بہبودی و منفعت رسانی میں صرف کردے یہ ترک دنیا اجتماعی ترقی کا کامیاب ذریعہ اور نظام اجتماعی کا شیرازہ محکم ہے۔ ایسے تارک دنیا اشخاص کا وجود باعث پستی نہیں بلکہ قوم کو بلند سے بلند معراج ترقی پر پہونچانے کا ضامن ہے۔

اکثر باتیں ایسی ہوتی ہیں جو نتیجۃً متحد ہیں۔ لیکن صورت و نوعیت اور اسباب و مقدمات کی بنا پر اُن میں ممدوح و مذموم ہونے کی حیثیت سے تفرقہ ہو جاتا ہے پھٹا ہوا لباس، روکھی سوکھی روٹی، محتاجی و بے سروسامانی ایک چیز ہے۔ لیکن یہ کبھی بیکاری و عاجزی کا نتیجہ ہوتی ہے کہ انسان ہاتھ پہ ہاتھ رکھے بیٹھا رہا۔ دنیا میں کوئی کام ہی نہ کیا۔ اور نہ کبھی تحصیل معیشت میں کوشش کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ دوسروں کا دست نگر و محتاج رہا اور نکبت و افلاس کی بلا میں گرفتار ہوا یہ محتاجی و بے سروسامانی کبھی مدح و ثنا کے قابل نہیں سمجھی جاتی اور نہ وہ تحسین و آفرین کی مستحق ہے۔ اس صورت سے محتاج نہ بننے والا خدا کی دی ہوئی

نعمت کے کفران اور اُس کی عطا کی ہوئی طاقتوں کی ناقدرشناسی کا مرتکب ہے اور اگر ترک دنیا کا یہ مفہوم سمجھا جاتا ہے تو وہ غلط ہے، اور اسلامی تعلیمات کے خلاف لیکن کبھی یہ بے سر و سامانی و پریشانی اس امر کا نتیجہ ہے کہ انسان نے تحصیل معاش میں جد و جہد اور کسب معیشت میں کد و کاوش کی اور کرتا ہے۔ اور اُس میں کامیاب بھی ہوا لیکن جو کچھ ملتا ہے اُس کو اپنی ذات پر صرف کرنے کے بجائے دوسروں پر صرف کرتا ہے۔ خود بھوکا رہتا ہے۔ لیکن دوسروں کا پیٹ بھرتا ہے۔ خود پھٹے کپڑے پہنتا ہے۔ لیکن بہتیروں کو لباس پہنا دیتا ہے۔ خود فقیروں کی زندگی بسر کرتا ہے لیکن کتنے فقراء کی زندگی کا سامان کر دیتا ہے۔ یہ فقر و فاقہ اور پریشان حالی وہ ہے جو روح عزت اور جوہر کمال ہے۔ اس کا نام ہے ایثار، اس کا نام ہے مواسات، وہ پھٹا ہوا لباس شاہوں کے تاج سے زیادہ وقیع اور سوکھی روٹی سلاطین کے خوان نعمت سے زائد باوقار ہے اور اس فقر و فاقہ میں وہ جاہ و جلال ہے، جو ارباب دولت و اقتدار و اہل ثروت و سرمایہ کو نصیب نہیں۔

یہ ترک دنیا وہ ہے جس کو مکمل صورت سے امیرالمومنین علی ابن ابی طالب نے پیش کیا تھا وہ ہاتھ پر ہاتھ رکھکر نہیں بیٹھے تھے، اُنھوں نے اموال دنیا کے حاصل کرنے اور کسب معیشت میں کد و کاوش کو ترک نہیں کیا تھا۔ اُنھوں نے اپنے دست و بازو اور قوت و طاقت کو بیکار نہیں رکھا تھا۔ لیکن اس مال کو انھوں نے کیا کیا؟ خود فاقوں پر فاقے

کیے، پھٹا ہوا پیوند دار لباس پہنا، فقراء کی سی زندگی بسر کی، لیکن مظلوموں کی گلو خلاصی کی۔ فقراء کی خبر گیری اور غرباء کو منفعت رسانی فرمائی اُن کے متعلق یہ حدیث سابق میں گذر چکی ہے کہ ان امیرالمومنین اعتق الف مملوک من کدیدہ " امیر المومنین ع نے ایک ہزار غلام اپنے ہاتھ کی کمائی سے خرید کر آزاد کیے" اگر وہ چاہتے تو اپنے لیے اسی سرمایہ سے عمدہ مکان بنوا لیتے اچھے اچھے لباس تیار کراتے اور لذیذ کھانے کھاتے۔ مگر انھوں نے ایسا نہیں کیا۔ اُن کا معیار نظر اس سے بہت بلند تھا۔ اُنھوں نے دنیاوی لذائذ سے خود متمتع ہونا کبھی گوارا نہ کیا۔ اور نہ سونے چاندی کے انبار لگا کر خزانوں کا منھ بھرا۔ اُن کا قول تھا کہ یا صفراء و یا بیضاء غری غیری "اے سنہرے روپہلے دل لبھانے والے سکّو۔ کسی اور کو جا کر فریب دو، مجھ پر تمھارا جادو نہیں چل سکتا۔"

ان کا ارشاد تھا۔ طلقتک ثلاثا لارجعة بعدھا۔

اے دنیا میں نے تجھ کو تین مرتبہ طلاق دیا ہے جس کے بعد رجوع ممکن نہیں۔

ہر زبان کے کچھ محاورات ہوتے ہیں۔ اور وہ اکثر و بیشتر مجاز یا کنایہ پر مبنی ہوتے ہیں۔ ان میں حقیقت کے تمام خواص و لوازم کا تلاش کرنا اُن کے اصلی مفاد سے علیحدہ ہو جانے کا مرادف ہے۔ کسی کی اولاد جاتی ہے تو وہ کہتا ہے میری تمام

عمر کی کھیتی برباد ہو گئی۔ اب کیا اُس سے دریافت کیا جائے گا کہ کھیتی کہاں تھی؟ وہ کس زمین پر تھی اور اُس میں پانی کس طرح دیا جاتا تھا۔ اور جو کچھ کھیتی کے لوازم ہیں وہ اُس میں کب موجود تھے؟ ہرگز نہیں بلکہ کھیتی برباد ہونا صرف اسی اعتبار سے ہے کہ تربیت اور نشو ونما کے حصول میں محنت کی گئی اور وہ ضایع ہو گئی۔

کبھی کہتا ہے کہ "میرا چراغ گل ہو گیا" اب کیا اس سے یہ سمجھا جائے گا۔ کہ چراغ دن کو خاموش اور رات کو روشن کیا جاتا ہے تو وہ فرزند بھی اسی صورت سے دن کو مخفی رات کو ظاہر رہتا تھا۔"

حسین چہرہ کی تشبیہ آفتاب سے صحیح ہے۔ لیکن اُس کے لمعنے کے لیے چرخ چہارم کی ضرورت نہیں اور رخسار کی تعبیر گلاب سے درست ہے مگر اُس میں خوشبو کے تلاش کی حاجت نہیں ہے۔

امیر المومنین کا یہ ارشاد کہ طلقتك ثلثا لا رجعة بعدها "مَیں نے دنیا کو تین مرتبہ طلاق دیا جس کے بعد رجوع نہیں" حقیقی اعتبار سے تو ہے نہیں اس لیے کہ طلاق عورت سے مخصوص ہے جو بطریق عقد دائم انسان کی زوجیت میں داخل ہوئی ہو اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا نہ کوئی مجسمہ ہستی ہے۔ نہ وہ نوع انسانی کی کسی صنف میں داخل ہے جو عورت کہی جا سکے اور اُس سے تعلقات ازدواج کا قطع کرنا حقیقی معنی میں طلاق ہو۔ بلکہ یہ صرف استعارہ

کی صورت سے ارشاد ہوا ہے۔جس کے معنی یہ ہیں کہ جس طرح وہ عورت جس کو تین مرتبہ طلاق دیا جاچکا ہو۔ انسان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے جدا ہوتی ہے اور کبھی اُن میں تعلقات قائم نہیں ہوتے۔ اُسی طرح مجھ کو تجھ سے ایسی بے تعلقی ہے۔جو تغیر و تبدل کے قابل نہیں ہے۔

اب یہ سوال پیدا نہیں ہوتا کہ طلاق اُس وقت صحیح ہے جب انسان تعلقات ازدواج رکھتا ہو تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر المومنینؑ کا، دامن کبھی دنیا سے ملوث ہوا تھا۔نیز طلاق بائن ہمارے مذہب کی بنیاد پر اُس وقت ہوتا ہے۔جب ایک مرتبہ طلاق دے کر پھر رجوع کرے اور پھر طلاق دے اور پھر رجوع کرے۔ اسی صورت سے جب تیسری مرتبہ طلاق دے تو پھر وہ عورت بائن ہوجاتی ہے تو کیا امیر المومنینؑ کے طرزِ عمل میں بھی دنیا کے ساتھ یہ انقلابات و تغیرات ہوتے رہے۔ اس کے علاوہ اس دنیا سے مراد اگر دنیائے ممدوح ہے تو اُس کو طلاق دینے کے کیا معنی؟ اور اگر دنیائے مذموم ہے تو اُس سے ملوث ہونے کا کیا موقع تھا جو طلاق کی ضرورت ہوتی؟

ان تمام خیالات کی بنیاد اسی پر ہے کہ طلاق کے مفہوم کو حقیقی معنی میں سمجھکر اُس کے تمام لوازم کی جستجو کی جائے لیکن حقیقت امر جیسا کہ میں نے بیان کیا اس طرح نہیں ہے بلکہ اپنی کامل بے تعلقی کی تشبیہ مطلقہ ثلاثہ یعنی تین مرتبہ طلاق دادہ شدہ عورت سے ہمیشہ کے

قطع تعلق کے ساتھ دینا منظور ہے جس میں وجہ مشترک اور سبب مشابہت آیندہ کی بے تعلقی ہے نہ سابق کے تعلقات۔

اب یہ بے تعلقی ہے کس وقت سے؟ اس کی تو تحدید نہیں کی گئی ہے اور نہ یہ کہا گیا کہ اب میں تجھ کو طلاق دیتا ہوں تاکہ شبہ پیدا ہو سکے قبل کے تعلقات کا۔ بلکہ ارشاد کیا طلقتك ثلثا میں تجھ کو طلاق دے چکا ہوں یعنی اتنی بے تعلقی کر چکا ہوں جو تین مرتبہ طلاق دینے سے پیدا ہو سکتی ہے۔

اب یہ سمجھنے کا حق باقی ہے کہ اس بے تعلقی کی ابتدا، ابتدا فطرت اور آغاز تخلیق سے شروع ہوتی ہے۔ لہذا اس کے لیے کسی خاص زمانہ کی حد مقرر کرنا صحیح نہیں ہے۔

یہ تھا وہ ترک دنیا جس کو امیر المومنین ؑ نے کیا تھا لیکن اس کے یہ معنی ہرگز نہ تھے کہ مال دنیا کی تحصیل اور کسب معیشت کی جد وجہد ہی ناقابل معافی الزام اور مستوجب مذمت جرم ہے، بیشک طلب دنیا اگر صرف ذاتی منفعت رسانی و لذت کشی و خودنمائی و خودستائی کے لیے ہے تو وہ قابل نفرت سرمایہ داری ہے مگر جب وہ خلق خدا کی بہبودی اور منفعت رسانی کے لیے ہو تو وہ قابل مدح و ستایش ہے اور اس پر واضح الفاظ میں معصوم نے روشنی ڈالی ہے جب کسی شخص نے امام جعفر صادق ؑ سے عرض کیا۔ واللہ انا لنطلب الدنیا ونحب ان نوتی بھا۔ بخدا ہم میں دنیا طلبی پائی جاتی ہے اور ہمارا دل چاہتا ہے

کہ دنیا ہمارے ہاتھ آتی۔"

حضرت نے فرمایا تحب ان تصنع بھا ماذا۔ یہ تو بتلاؤ کہ تم دنیا کو حاصل کرکے کرنا کیا چاہتے ہو؟ قال اعود بھا علی نفسی و عیالی واتصدق بھا واحج واعتمر۔ "عرض کیا یہی کہ دنیا کو حاصل کرکے اپنے اور اپنے اہل وعیال کے لیے اسباب زندگی مہیا کروں اور لوگوں کو خیرات دوں، اور حج وعمرہ بجالاؤں۔" حضرت نے فرمایا لیس ھذا طلب الدنیا ھذا طلب الاخرۃ پھر یہ تو دنیا طلبی نہ ہوئی بلکہ یہ حقیقۃً آخرت کی طلب ہے۔"

اب بھی کیا زیر بحث مسئلہ میں کوئی گنجلک باقی رہ گئی؟ کیا یہ خیال اب حق بجانب سمجھا جا سکتا ہے کہ طلب معیشت میں کوشش اور تحصیل مال حلال میں جدوجہد ہی ترک دنیا کے منافی اور اسلامی تعلیمات کے خلاف ہے۔ کیا اس امر میں کوئی شبہ باقی رہ گیا کہ اسلام اُس صورت سے جو عام طور پر سمجھی جاتی ہے ترک دنیا کا حامی نہیں ہے بلکہ اس طرح کا ترک دنیا نظام اجتماعی اور مفاد ملی اور مصالح قومی کے ساتھ سخت ترین دشمنی اور بے انصافی ہے جس کی اسلام کبھی اجازت نہیں دیتا۔

# دوسرا خیال اور اُس کا دفعیہ
# مسئلہ تقدیر کا حل
# اور
# خدا کو رازق سمجھکر کسب معاش کو غیر ضروری سمجھ لینے کا ابطال

ایک دوسرا خیال جو بہ اعتبار اپنے نتائج اور مضر اثرات کے پہلے خیال سے زیادہ مہلک اور سمیت آمیز ہے لیکن اکثر دماغوں میں راسخ ہے۔ وہ یہ ہے کہ دنیاوی حوادث اور انسانی حالات کا تغیرو تبدل قضا و قدر الٰہی کا پابند ہے اور جو کچھ تقدیر میں ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اور اسی تقدیر پر جو مشیت باری کا نتیجہ ہے مستقبل کا دار و مدار ہے تو اب انسان جد و جہد کرے دست و پا کو حرکت دے۔ میدان عمل میں سعی و کوشش کرے یا یہ کچھ نہ کرے۔ بہر حال جو کچھ ہونے والا ہے۔ اُس کے لئے وہ ہوگا۔ تو پھر اس تمام کد و کاوش کی ضرورت اور سعی کی حاجت ہی کچھ بھی نہیں بلکہ انسان خدا کی مشیت سے لو لگائے بیٹھا رہے اور جو کچھ اُس کی جانب سے ہو اچھا ہو یا بُرا اُس کا بہ کشادہ پیشانی استقبال کرے بخصوص طلب معیشت وغیرہ کے متعلق اس خیال کو دوسری لفظوں میں یوں پیش کیا جاتا ہے کہ خدا رازق ہے اور اُس نے ہر ذی روح کے لیے رزق مقرر

فرما دیا ہے، وہ رزق ملے گا ضرور خواہ انسان جد وجہد، سعی وعمل کرے یا نہ کرے۔

تو اب وہ دوکانداری، پیشہ وری، کاشتکاری، دستکاری وغیرہ وغیرہ جتنے ذرائع کسب معیشت ہوں، سب بے نتیجہ اور عبث ہیں۔ کیونکہ وہ نہ مقررہ رزق میں زیادتی کر سکتے ہیں اور نہ انسان کا صبر وسکون اور خاموشی اور ان ذرائع سے کنارہ کش ہونا اس میں کمی پیدا کر سکتا ہے، وہ رازق ہے اور جب وہ رازق ہے تو رزق عطا کرے گا ضرور، انسان اسی پر اعتماد کیے بیٹھا رہے اور یہی معنی ہیں توکل کے جو مذہبی تعلیمات میں خاص اہمیت رکھتا ہے۔

یہ ہے وہ خیال جو اکثر خوش عقیدہ اور پاک طینت لیکن سادہ لوح مسلمانوں کے ذہن میں قائم ہو گیا ہے لیکن افسوس ہے کہ وہ بھی حقیقۃً معرفت قضا وقدر اور مذہبی معارف وتعلیمات سے ناواقفیت کا نتیجہ ہے۔

مذکورہ بالا نظریہ یا خیال کے متعلق سب سے پہلے یہ دیکھنا چاہیے کہ یہ افراد خود اپنے دور حیات اور نظام زندگی میں کسب معاش کے علاوہ دوسرے شعبوں میں اس عقیدہ پر کہاں تک عامل نظر آتے ہیں اور اس سے معلوم ہو گا کہ وہ افراد جو اس عقیدہ کے داعی ومبلغ ہیں خود اپنی عملی زندگی میں اس کی مخالفت پر مجبور ہیں "جو کچھ ہونا ہے وہ ہو گا۔ لہذا انسان کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں"۔ اگر کلیہ کے طور پر یہ بالکل صحیح تسلیم کر لیا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہے کہ انسان کو کسی مقصد کے حصول میں کسی قسم کی بھی جدو

جہد حق بجانب اور ضروری نہ ہو۔ مریض مبتلائے مرض ہو اور تیماردار خواب استراحت میں رہے، طبیب کی طرف رجوع اور مرض کی تشخیص اور نسخہ کی تجویز اور دوا کے استعمال کی ضرورت نہیں اس لئے کہ جو کچھ ہونا ہے وہ تو ہو وے ہی گا۔

سامنے سے شیر کے ہمہمہ کی آواز اور اُس کی آمد اور انسان فرار کرنے پر قادر لیکن ہاتھ پاؤں کو حرکت نہ دے اس لیے کہ جو کچھ تقدیر میں ہے وہی ہوگا بھوک کی شدت اور سامان غلہ گھر میں موجود لیکن اُٹھکر پکانا، سامنے لانا، ہاتھ کو گردش دینا اور لقموں کو دہن تک لیجانا سب بیکار اس لیے کہ اگر سیر ہونا مقدر میں ہے تو ضرور ہوگا۔ اور پھر خدا رازق ہے۔ رزق پہنچائے گا ضرور۔ ہاتھ پیروں کو حرکت دینے کی ضرورت؟

کسی مقصد کے لیے پہونچنا ضروری مثلاً واعظ کی تقریر سننے کا اشتیاق، لیکن کپڑے پہننا۔ گھر سے باہر نکلنا، قدم قدم راستہ قطع کرنا یہاں تک کہ جلسہ میں جاکر بیٹھنا اور زحمت گوارا کرنا سب فضول اس لیے کہ تقریر کی سماعت ہونا ہے تو ہوگی اس تمام جد وجہد کی ضرورت کیا۔؟

بیشک اگر ہر چیز قضا و قدر کی بنا پر اس طرح ہوتی ہے کہ انسانی جد وجہد کے ہونے نہ ہونے کو اس میں دخل نہیں تو اس میں یہ اور ان کے ایسے ہزاروں نتائج پیدا ہونا ناگزیر ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ مذکورہ بالا صورت عالم انسانی کے ہر جزو وکل کی سیرت زندگی اور طرز عمل کے خلاف ہے وہی لوگ جو بلند بانگ آواز سے قضا و قدر الٰہی کا نام لیکر اپنے کو حلب

حلال اور کسب معیشت کے فرائض سے سبکدوش بننا چاہتے ہیں وہ بھی دوسرے زندگی کے شعبوں میں اس کلیہ پر قائم نہیں رہتے، کوئی بیمار ہوتا ہے، تو اُس کا علاج کرتے ہیں، بھوک لگتی ہے تو کھانا پکواتے ہیں اور کھاتے ہیں، کوئی ضرورت ہوتی ہے تو خود راستہ قطع کرتے اور اُس جگہ جاتے ہیں، کوئی دشمن حملہ کرتا ہے تو مدافعت کرتے ہیں۔ غرض ہر شے کے لیے جو اُس کے اسباب ہیں ان کو خود اپنی عملی جد وجہد سے مہیا کرتے ہیں اور یہ نہیں کہتے کہ ہم کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں جو ہونا ہے وہ ہوگا۔ لیکن ادھر کسب معاش کا مسئلہ پیش ہوا اور بڑے خدا پرست و توکل پیشہ بن کر فرمانے لگے کہ جتنا مقدر میں ہے وہ خدا دے گا ضرور، محنت کریں یا نہ کریں۔

کیا اس کے یہ معنی نہیں ہیں کہ صرف بیکاری کی زندگی اور طلب معیشت میں عاجزی و درماندگی کو حق بجانب ثابت کرنے کے لیے یہ ایک بہانہ ہے جو مذہبی عقیدہ کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے، ورنہ اگر عقیدہ پر سچا ایمان ہوتا تو اُس کا اثر زندگی کے دوسرے شعبوں میں بھی ضرور نظر آتا، اب مجھ کو یہ دیکھنا ہے کہ حقیقۃً یہ خیال قضا و قدر کے مسئلہ کے تحت میں صحیح بھی ہے یا نہیں؟

بیشک قضا و قدر حق ہے اور عالم تکوین کا ہر حادثہ قرار دادِ الٰہی کا پابند ہے اور یقیناً جو شے جس صورت سے مقدر ہو اُسی صورت سے انجام پذیر ہونا ضروری ہے، لیکن دیکھنا اس بات کا ہے کہ قضا و قدر

الٰہی جاری کس طرح پر ہوتی ہے۔ اور قرار داد یادی کی نوعیت کیا ہے اور تقدیر کس صورت پر قائم ہوتی ہے۔ جس طرح اور جس نوعیت میں اور جس صورت پر قضا و قدر کا نفاذ ہوا ہے وہی ہو کر رہے گا اور اُس میں تغیر و تبدل ناممکن ہے۔ عالم امکان اور دنیا کے مقررہ نظام کا جب جائزہ لیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ اُس کی بنیاد ذرائع و اسباب پر قرار دی گئی ہے اور بغیر کسی غیر معمولی مصلحت کے، جو اعجاز و کرامت کا باعث ہو اس اصول کی مخالفت نہیں ہوا کرتی۔ ابر آئے تو پانی برستا ہے، آفتاب طالع ہو تو دھوپ نکلتی ہے۔ آگ ہو تو شعلے اُٹھتے ہیں، پانی ہو تو آگ بجھتی ہے۔ پیاس بجھانے کے لیے پانی پینے کی ضرورت اور بھوک جانے کے لیے کھانا کھانے کی حاجت ہے، جو شخص پہاڑ سے ٹکر لگائے پاش پاش ہوگا۔ آگ میں پھاندے جل کر خاک ہوگا۔ سنکھیا کھائے ہلاک ہوگا۔ سمندر میں پھاند پڑے غرق ہوگا۔ غرض جیسے اسباب و ذرائع مہیا ہوں ویسا نتیجہ برآمد ہوگا۔ اور درحقیقت کسی شے کے اچھے بُرے نتائج ظاہر ہونے کی ذمہ داری انسان پر ان ہی اسباب و ذرائع سے عائد ہوتی ہے جو ان نتائج کے موجب ہیں اگرچہ خود وہ نتائج انسان سے مجبوری اور بے بسی کے عالم میں نمودار ہوں لیکن وہ اس کے ہاتھوں ہوتے ہیں اس اعتبار سے کہ وہ ان کے اسباب کا ذمہ دار ہے،

بندوق کا رُخ کسی کی طرف کر کے فیر کرنے والا اُس کا قاتل ہے، حالانکہ روح و بدن کا افتراق نفس کی آمد و شد کا انقطاع، حرکت قلب

کا رُکنا اور دم کا نکلنا اس کے ہاتھ کا کام نہ تھا اور گولی کا پڑنا اُس کا در آنا اور سینہ توڑ کر نکل جانا بھی اُس کے بس کی بات نہ تھی۔ اور نہ جب وہ گولی ہوا کے دامن میں اور فضا کی آغوش میں پوری قوت کے ساتھ جا رہی تھی تو یہ اُس کے روکنے پر قادر تھا۔ لیکن پھر بھی قاتل یہ ہے اس لیے کہ بندوق کا رخ اُس طرف کر کے اس انداز کی تحریک جس کا نام ہے فیر اس کا کام تھا اور اختیاری کام، اس لیے آخر تک جتنے نتائج ہوں وہ اسی کے دست وبازو کا کرشمہ ہیں۔

انسان کی کسی خاص نتیجہ پر تعریف یا مذمت بھی ان ہی اسباب کی بنا پر ہوتی ہے جنھیں وہ باختیار خود فراہم کرتا ہے۔ بے شک غیر معمولی حوادث کبھی نتیجہ کو انسان کے مزعومہ اسباب وذرائع سے علیحدہ بھی کرتے ہیں جس کا کبھی تو یہ باعث ہوتا ہے کہ انسان کی نظر نے اسباب کی تشخیص میں غلطی کی اور جس کو وہ سبب سمجھتا تھا حقیقۃً وہ سبب ہی نہ تھا فریب نظر تھا اور سراب خیال لہٰذا اسباب ومسببات کے فلسفہ کا قدرتی تقاضا ہی یہ تھا کہ وہ نتیجہ حاصل نہ ہو اور کبھی انسان اسباب مہیا کرتا ہے اور ٹھیک ترتیب سے لیکن قدرت کی طرف سے کوئی غیر معمولی مانع پیدا کر دیا جاتا ہے جو اُن اسباب کی کامیابی میں سدراہ ہو جاتا ہے۔ یہ کامیابی وعدم کامیابی انسان کے بس کی بات نہیں اور نہ وہ اس کا ذمہ دار ہوتا ہے لیکن اُس کی ذمہ داری اسباب وذرائع کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور اسی پر وہ مدح یا قدح تعریف وثنا یا سرزنش وملامت

کا مستحق بن جاتا ہے۔

بندوق چلائی اور پوری قوت کے ساتھ اور یہ سمجھکر کہ فلاں شخص پر جا کر لگے لیکن اتفاق سے نشانہ نے خطا کی اور گولی ہٹ کر پڑی، اس سے وہ شخص بری نہیں ہو سکتا جس نے گولی کا فیر کیا تھا۔ وہ مجرم ہے اور بہرحال مجرم، یہ اور بات ہے کہ جو نتیجہ تھا وہ حاصل نہوا۔ یا اگر وہ حملہ کسی صحیح مقصد سے اور فریضہ کے تحت میں تھا تو گولی لگا کر ہی وہ اپنے فرض سے ادا ہوا اور مدح و ثنا کا مستحق بن گیا، کامیابی و عدم کامیابی کا مرحلہ جداگانہ ہے۔ اسی کو عرب کے فلسفی شاعر نے یوں کہا ہے۔

علی المرء ان یسعی بمقدار جھدہ

ولیس علیہ ان یکون موفقا

انسان اپنی سی کرے، نتیجہ کی ذمہ داری اور کامیابی و عدم کامیابی اُس کے فرض سے خارج ہے۔

رزق اور اُس کے مختلف مراتب یہ بھی اسی مقررہ نظام عالم کے تحت میں ہیں جو اسباب و ذرائع کا پابند ہے ابی اللہ الا ان یجری الاشیاء علی اسبابھا۔

خدا نے انکار کیا ہے اس بات سے کہ اشیا کی رفتار اسباب طبیعہ کے خلاف ہو۔

بیشک مشیت آلٰہیہ بدل نہیں سکتی اور خدا کی تقدیر کے خلاف ممکن نہیں، لیکن دیکھنے کی ضرورت ہے کہ تقدیر آلٰہی جاری کس طرح ہوئی ہے؟

اگر تقدیر الٰہی مطلق ہے اور غیر مشروط تو اُس کا پورا ہونا بہرحال ضروری ہے، خواہ انسان سعی و عمل کرے یا نہ، کسب معیشت میں زحمت و مشقت اُٹھائے یا نہ لیکن اگر تقدیر الٰہی مشروط ہے اور قرار داد یوں ہی ہوئی ہے کہ جب انسان سعی و کوشش کرے اور جد وجہد سے کام لے تو اُسے اتنا رزق عطا کیا جائے تو اس کا اقتضا یہ ہے کہ بس سعی و کوشش کی صورت میں وہ رزق حاصل ہو بغیر سعی و طلب اور معیشت میں جد وجہد کے اُس رزق کا حاصل ہونا تقدیر الٰہی کے خلاف اور معینہ قرار داد کے منافی ہے۔

اب اگر انسان ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہا اور بسر زندگی کے اسباب مہیا کرنے میں کوتاہی کی نتیجہ میں تنگدستی و احتیاج اور فقر و فاقہ کی مصیبت میں گرفتار ہوا تو اُس کی ذمہ داری خود اُس کے غلط طرز عمل پر ہے۔ لیکن اگر اُس نے اپنے مقدور بھر جد وجہد کی اور زحمت و مشقت برداشت کی اور اُس کا کچھ نہ کچھ نتیجہ حاصل ہوا تو وہ تقدیر الٰہی کا نتیجہ ہے اس لیے کہ انسان کا کام کوشش کرنا ہے اور کامیابی عطا کرنا خدا کی طرف سے ہے۔

کوشش کے بعد اگر ناکامی ہو تو پھر انسان پر کوئی الزام نہیں، معلوم ہوگا کہ مصلحت باری یہ ہے کہ کچھ روز تک اُس کو تکالیف برداشت کرنا پڑیں، وہ صبر کا موقع ہے اور اگر کامیابی ہو تو وہ خداوند عالم کی جانب سے ہے اُس پر شکر کا موقع ہے لیکن اگر انسان نے کوشش نہ کی اور اس لیے سختی میں زندگی گذاری تو وہ اُس کے ہاتھوں سے ہے اُس پر دوسروں کو

ملامت کا موقع ہے۔

حضرت احدیت عزاسمہ نے انسان کی ذمہ داری بالکل اپنے اوپر نہیں لی ہے تاکہ انسان کی قوت عمل سلب نہ ہو اور اسباب مہیا کرنے کا وہ ذمہ دار ہے لیکن ان اسباب میں کامیابی عطا کرنا اپنے ہاتھ میں رکھا ہے کہ انسان اپنی قوت عمل پر بھروسا کرکے اپنے کو اس سے بے نیاز نہ سمجھے اور اُس کے سامنے سر تسلیم خم کرتا رہے

وہ رازق ہے یعنی عطا کرنے والا وہی ہے لیکن اُن اسباب کے ذریعہ سے جنھیں انسان کو مہیا کرنا چاہیے اس طرح ایک طرف انسان جد وجہد کے فرض سے سبکدوش نہیں معلوم ہوتا اور دوسری طرف خدا پر توکل کے معنی ظاہر ہوتے ہیں اور اُس کی رازقیت کا عنوان معلوم ہوتا ہے اُس کو رازق سمجھکر ہاتھ پہ ہاتھ رکھکر بیٹھ جانے والے غلط راستے پر ہیں جس طرح وہ جو صرف اپنی ذاتی محنت پر بھروسا کرکے اپنے کو خدا سے مستغنی سمجھنے لگے ہوں۔ کسب معاش میں زحمت و مشقت برداشت کرنے کے بعد محرومی و ناکامی سے دوچار ہونا یا دو پیشہ وروں میں جو خاص موقع و وقت، خاص صورت، خاص اسباب و ذرائع کے ساتھ مصروف عمل ہوئے ہوں ایک کو زیادہ نفع ہونا اور دوسرے کو کم اُس خودمختار غیبی طاقت کے کرشمے اور انسانی محدود طاقت پر اعتماد کرنے والوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہیں لیکن اس ناکامی کے یہ معنی نہیں ہیں کہ انسان اپنی قوت عمل کے صرف کو بیکار سمجھکر خاموش بیٹھا رہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ حقیقۃً رزق کے مسئلہ میں قضاؤ قدر الٰہی کس صورت پر جاری ہوئی ہے یقیناً اس کو وہی بتا سکتے ہیں جو حقیقت شناس رموز

قدرت اور سبق خوان مدرسۂ الوہیت ہوں، جن کو لوح محفوظ کے مندرجہ نقوش اور عالم تقدیر کے تمام کائنات کا براہ راست علم دیا گیا ہو۔ اُنھوں نے بتلا دیا کہ خدا کی رازقیت کس طرح ہے اور تقدیر الٰہی کی نوعیت کیا ہے اُن کا ارشاد ہے کہ تسعۃ عشار الرزق فی التجارۃ رزق کے فی صدی نوّے حصہ تجارت میں مضمر ہیں اُس کے معنی یہ ہیں کہ بغیر تجارت فی صدی دس حصہ رزق کا حاصل ہو سکتا ہے لیکن فی صدی نوّے حصہ وہ ہے جو تجارت کے ساتھ مشروط ہے۔

اُن کے ارشادات و ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اُنھوں نے اس خیال کی خاص طور پر رد کی ہے کہ خدا کے رازق ہونے کی بنا پر انسان کو جد وجہد کی ضرورت نہیں اُنھوں نے جتلایا ہے کہ انسان پر سعی وکوشش فرض ہے اور اپنے مقدور بھر ہاتھ پاؤں کو حرکت دینا لازم ہے۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ خیال سادہ لوح افراد کے دل میں آج نہیں بلکہ بہت پہلے زمانۂ رسولؐ میں پیدا ہوا تھا لیکن اس کی فوراً رد کی گئی چنانچہ امام جعفر صادق علیہ السلام فرماتے ہیں۔ انّ قوما من اصحاب رسول اللہؐ لما نزلت ومن یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب اغلقو الابواب واقبلوا علی العبادۃ وقالوا قد کفینا فبلغ ذالک النبیؐ فارسل الیھم فقال ما حملکم علی ما صنعتم فقالوا یا رسول اللہ تکفل اللہ لنا بارزاقنا فاقبلنا علی العبادۃ فقال انہ من فعل ذلک لم یستجب لہ علیکم بالطلب" کچھ لوگ اصحاب رسولؐ میں سے جب یہ آیت

نازل ہوئی کہ جو شخص تقویٰ اختیار کرے خدا اُس کے لیے کشائش پیدا کرتا ہے اور غیر معلوم طریقوں سے اُس کو رزق عطا فرماتا ہے۔ تو اُنھوں نے دروازے گھروں کے بند کر لیے اور عبادت الٰہی میں مصروف ہو گئے۔ اور کہا کہ اب کیا ضرورت خدا ہمارے رزق کا ذمہ دار ہو ہی گیا۔ یہ خبر جناب رسالتمآب کو پہونچی حضرت نے اُن کے پاس آدمی بھیجا اور فرمایا کہ یہ تم نے کیا کیا؟ انھوں نے عرض کیا یا رسول اللہ خدا نے تو ہمارے رزق کی ذمہ داری کر لی ہم اُس کی عبادت میں مصروف ہو گئے۔ حضرت نے فرمایا تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جو ایسا کرے اُس کی کوئی دعا خداوند کریم کی بارگاہ میں قبول نہیں ہے تمھارا فرض ہے کہ تم طلب معاش کرو۔

اس حدیث سے حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے اور کوئی شبہ باقی نہیں رہتا، اس کے بعد بھی ائمہ معصومینؑ موقع بموقع اِس خیال کی کمزوری کو ظاہر فرماتے اور بتلاتے رہے ہیں کہ انسان کے لیے ظاہری اسباب و ذرائع سے بے نیاز ہونا ممکن نہیں ہے ملاحظہ ہو عمر بن یزید کی روایت، امام جعفر صادقؑ سے فرماتے ہیں ارأیت لو ان رجلا دخل بیتہ واغلق بابہ اکان یسقط علیہ شئ من السماء؟ تم خود سمجھو کہ اگر انسان گھر میں بیٹھ رہے اور دروازہ بند کر لے تو کیا چھت پھاڑ کر آسمان سے کچھ اُس کو مل جائے گا۔

**دوسری حدیث** میں جناب رسالتمآب کی زبانی نقل فرماتے ہیں کہ حضرت نے فرمایا ان اصنافا من امتی لا یستجاب دعاؤھم میری امت میں چند قسم کے لوگ ایسے ہیں جن کی دعا قبول نہیں ہو سکتی۔ اسی سلسلہ میں ارشاد ہوتا ہے

ورجل يقعد فى بيته ويقول يارب ارزقنى ولا يخرج ولا يطلب الرزق فيقول الله عزوجل عبدى الم اجعل لك السبيل الى الطلب والتصرف فى الارض والجوارح صحيحة فتكون قد اعذرت فيما بينى و بينك فى الطلب لاتباع امرى ولكيلا تكون كلا على اهلك ”، ایک وہ شخص ہے جو اپنے گھر میں بیٹھا رہے۔ اور کہے خداوندا! مجھے روزی عطا کر لیکن گھر سے نکلے نہ اور روزی کی تلاش نہ کرے تو خداوند عالم (عالم معنی میں) اُس سے خطاب فرماتا ہے کہ اے میرے بندے کیا میں نے تجھ کو تحصیل معاش کی قوت، اور اطراف زمین میں نقل و حرکت کی طاقت اور اعضاء و جوارح عطا نہیں کیے اس لیے کہ تو اپنے اعضاء و جوارح کو عمل میں لاکر میرے اور اپنے درمیان میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جا اور اپنے اعزہ و اقارب کے لیے بار دوش نہ بن“

تیسری حدیث۔ ارشاد ہوتا ہے انی لابغض الرجل فاغرا فاه الی ربه فیقول ارزقنی ویترك الطلب ”مجھ کو عداوت ہے ایسے شخص سے جو آسمان کے رخ پر منہ کھولے بیٹھا رہے“ خداوندا مجھکو روزی عطا کر، لیکن خود کوئی جد و جہد نہ کرے“

چوتھی حدیث۔ امیر المومنین نے آیۂ مبارکہ انه هو اغنی واقنی ”خدا ہی وہ ہے جو لوگوں کو غنی بناتا اور ان کے دلوں کو خوشنود کرتا ہے“ اس کی تفسیر میں ارشاد فرمایا ہے اغنی كل انسان بمعيشة وارضاه بكسب يده خدا غنی بناتا ہے ہر انسان کو لیکن اس کے ذاتی کسب معاش سے اور

وہ اُس کے دل کو خوشنود کرتا ہے مگر اُسی کے دست و بازو کی محنت سے"۔

**پانچویں حدیث**۔ امام جعفر صادقؑ فرماتے ہیں "یعجز احدکم ان یکون مثل النملہ فان النملۃ تجر الی حجرھا" کیا تم چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور ہو کیونکہ چیونٹی بھی اپنے سوراخ میں خود غذا گھینچ کر لیجاتی ہے" کیا اس سے بڑھکر صاف لفظوں کی ضرورت ہے؟

مطلب یہ ہے کہ چھوٹی سے چھوٹی چیز چیونٹی اُسکے بھی خدا نے اس طرح رزق کی ذمہ داری نہیں لی ہے کہ وہ اُس کو گھر بیٹھے رزق عطا کرے بلکہ خود چیونٹی نکلتی ہے خود اپنے گھر و بیرون سے رزق کی تلاش کرتی ہے اور اپنے مختصر دہن سے اپنے مقدار کفاف کو کھینچکر اپنے مسکن میں لے جاتی ہے تو پھر تم کیا چیونٹی سے بھی زیادہ کمزور ہو کہ تم اس بات سے متوقع رہو کہ بغیر ہاتھ پاؤں ہلائے تم کو گھر بیٹھے رزق عطا کیا جائے

**چھٹی حدیث**۔ امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں اصحاب کا مجمع تھا کہ علاء بن کامل حاضر خدمت ہوئے اور حضرت کے سامنے بیٹھ گئے۔ عرض کیا ادع اللہ ان یرزقنی فی طلب دعۃ خدا سے دعا فرمایئے کہ مجھ کو راحت و آرام کے ساتھ رزق عطا فرمائے بیشک بہت کامیاب نسخہ تجویز کیا تھا۔ امام کی دعا اور پھر اگر وہ ہوجاتی تو کیا ممکن تھا قبول نہ ہوتی۔ لیکن امام نے جواب دیا لا ادعو لک اطلب کما امرک اللہ عزوجل "میں دعا نہیں کروں گا جاؤ اور جیسا کہ خدا نے حکم دیا ہے خود طلب معاش کرو"۔

اسی طرح کی ایک روایت کلیب صیداوی کی ہے قلت لابی عبد اللہ ادع اللہ لی فی الرزق فقال اتطلبہ قلی اموس ہی ہو میں نے امام جعفر صادقؑ

سے عرض کی کہ ذرا خدا سے میرے لیے رزق کے بارے میں دعا کر دیجئے۔ اس لیے کہ میں آج کل بڑی مشکلات میں مبتلا ہوں۔ حضرت نے فرمایا لا اخرج فاطلب "نہیں گھر سے نکلو اور طلب معاش کرو۔"

امام ؑ نے دعا نہ کی اس لیے کہ قوت عمل سلب نہ ہو۔ اور ذاتی محنت و کاوش سے دست کشی کرکے آرام طلبی کی عادت نہ پڑے۔ امام موجود تھے۔ اور اُن سے دعا کی خواہش آسان اور دعا کر دینا بھی معمولی امر تھا لیکن امام ؑ نے دعا سے انکار کرکے ہمیشہ کے لیے ایک عظیم سبق دیدیا۔ کہاں ہیں۔ زیارت مشاہد مقدسہ سے مشرف ہونے والے اور ضریح مطہر کے سامنے قبہ مبارک کے نیچے ہاتھ اٹھا اُٹھا کر وسعت رزق اور خوشحالی و کشائش کی دعا مانگنے والے دعا مانگنا آسان ہے لیکن اُن کو کیا معلوم کہ ضریح مبارک سے عالم معنی میں یہی آواز نہ آجاتی ہوگی کہ نہیں ہم تمھارے لیے دعا نہ مانگیں گے جاؤ اور محنت مزدوری کرکے خود اپنی روزی حاصل کرو۔ بیشک جب انسان نے اپنی طاقت کو صرف کر دیا۔ اور اپنے مقدور بھر بھی کوشش کی تو اس کا فرض ادا ہوگیا۔ پھر خداوند عالم کا کام ہے کہ وہ اُس کو کامیابی عطا کرے کبھی وہ ایک کمزور دست وپا کی کمزور کوشش میں ایسی برکت عطا فرماتا ہے کہ بڑے بڑے طاقتور و توانا اشخاص کی جد وجہد میں حاصل نہیں ہوتی اسی سے ایک

تیسرے خیال کی کمزوری۔ ظاہر ہوتی ہے جس کو اکثر افراد اپنی بیکاری اور کسب معیشت میں کوتاہی کے حق بجانب ثابت کرنے کے لیے پیش کرتے ہیں اور وہ یہ کہ تجارت کے لئے سرمایہ کی ضرورت ہے اور ہمارے پاس سرمایہ ہی نہیں تو تجارت کیونکر کریں؟

حضور والا! تجارت کسی بڑی ایجنسی، بڑے کارخانہ، بڑے ادارے ہی کے قائم کرنے کا نام نہیں ہے، کسب معیشت اور تجارت کا مفہوم اتنا وسیع ہے کہ وہ زیادہ یا کم سرمایہ پر موقوف نہیں ہے، وہ ہزاروں لاکھوں روپیہ سے بھی شروع ہو سکتی ہے اور دو چار پیسوں سے بھی جس طرح لاکھوں روپیہ کی تجارت شروع کرنے کے بعد انسان اپنے فرض سے ادا ہو جاتا ہے لیکن اُس کی ترقی نشو و نما اور سود مندی کسی دوسری بالادست ہستی کی جانب سے ہے اسی طرح چند پیسوں کی تجارت شروع کر کے بھی انسان اپنے فرض سے ادا ہوتا ہے اور اُس میں خیر و برکت عطا کرنا دوسرے کا کام ہے۔ پھر اگر انسان کے پاس بہت زیادہ سرمایہ نہیں تو اس کے معنی یہ نہیں کہ جو کچھ اُس سے ممکن ہے، اُس سے بھی فائدہ حاصل نہ کرے۔

یہ سبق بھی ائمہ اہل بیت علیہم السلام کے اقوال سے بہت واضح طور پر حاصل ہوتا ہے ملاحظہ ہو، عبد الرحمٰن بن حجاج کی روایت، وہ کہتے ہیں کہ ہمارے ساتھیوں میں سے مدینہ میں ایک شخص تھا وہ سخت تنگدستی میں مبتلا اور فقر و فاقہ میں گرفتار ہوا، امام جعفر صادق ؑ نے فرمایا اذھب فخذ حانوتا فی السوق وابسط بساطا فلیکن عندک جرۃ ماء والزم باب حانوتک ثم ذکرانہ فعل ذلک وصبر فرزقہ اللہ وکثرمالہ واثری۔

جاؤ اور بازار میں ایک جگہ مقرر کر کے فرش بچھاؤ اور بس اپنے پاس ایک صراحی پانی کی رکھو لیکن کسی وقت دوکان پر سے ہٹو نہ یعنی پابندی کے ساتھ دوکان پر بیٹھو"، راوی کا بیان ہے کہ اس شخص نے امام کی ہدایت پر عمل کیا۔ اور خداوند عالم نے اسی ذریعہ سے اُس کو رزق عطا کیا اور کچھ دن میں اُس کی ثروت

میں اضافہ ہوا اور وہ مالدار ہو گیا بس اب حیلہ وبہانہ کے سلسلہ میں کوئی کڑی باقی نہیں رہی اور طلب معیشت میں کسی قسم کا عذر قابل سماعت نہیں رہا سرمایہ کی کمی کا عذر بالکل ناقابل سماعت قرار دیا گیا ہے اس لیے کہ انسان کے پاس کچھ روپیہ نہ ہو لیکن پانی تو ممکن ہے۔ انسان اُسی پانی کو لیکر لب راہ بیٹھ سکتا ہے آنے جانے والوں میں پیاسوں کی کمی نہیں ہوتی ہے اور انھیں ایک پیسہ دے کر ایک کٹورا پانی پی لینے میں کوئی عذر نہیں ہو سکتا۔

یہ درحقیقت مثال ہے۔ ضروری نہیں کہ انسان پانی ہی سے تجارت شروع کرے مقصد یہ ہے کہ کم سے کم جو چیز انسان سے ممکن ہے اُسی کا روزگار شروع کرے اور اپنی ذمہ داری کو پورا کر کے فرض کو انجام دے۔

اس قسم کے احادیث متعدد موجود ہیں، سدیر کی روایت ہے میں نے امام جعفر صادقؑ سے پوچھا ای شیئ علی الرجل فی طلب الرزق "طلب معاش کے سلسلہ میں انسان کا فرض کیا ہے" فقال اذا فتحت بابک وبسطت بساطک فقد قضیت ما علیک "حضرت نے فرمایا جب تم نے دروازہ کھول دیا اور زمین پر فرش بچھا کے کچھ لیکر بیٹھ گئے تو بس تم نے اپنے فرض کو پورا کر دیا۔

طیار کا بیان ہے کہ مجھ سے امام محمد باقرؑ نے دریافت فرمایا ای شیئ تعالج ای شیئ تصنع "تمھارا کیا روزگار ہے کون سا کاروبار کرتے ہو؟ قلت ما انا فی شیئ "میں نے عرض کیا کہ میں تو بالکل بیکار ہوں، کوئی روزگار نہیں ہے۔ حضرت نے فرمایا۔ فخذ بیتا واکنس فناءہ ورشہ وابسط فیہ بساطا فاذا فعلت فقد قضیت ما علیک "ایک جگہ مقرر کر و اور اُس کو صاف کر کے

پانی چھڑک کر اُس میں فرش بچھاؤ اور بیٹھ جاؤ اگر تم نے ایسا کیا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اپنا فرض ادا کر دیا راوی کہتا ہے کہ میں نے ایسا ہی کیا اور میرے کاروبار میں ترقی ہوئی اور مجھکو رزق عطا ہوا۔

ابو عمارہ طیار کی روایت قلت لابی عبد اللہ انہ قد ذھب مالی وتفوق ما فی یدی وعیالی کثیر "میں نے امام جعفر صادقؑ سے عرض کیا کہ میرا مال سب جاتا رہا اور جو کچھ تھا وہ متفرق ہو گیا اور میرے متعلقین بہت ہیں سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ حضرت نے فرمایا اذا قدمت فافتح باب حانوتک وابسط بساطک وضع میزانک وتعرض لرزق ربک" اپنی دوکان کا دروازہ کھولو اور فرش بچھاؤ اور ترازو لیکر بیٹھ جاؤ اور اس طرح خداوند عالم کے رزق کا اپنے کو مستحق ثابت کرو"

پھر اگر کچھ بھی انسان کے پاس نہ ہو کہ وہ اُس سے تجارت کر سکے اور اُس کو فروخت کرے تو انسان کے ذاتی اعضاء وجوارح دست، وبازو کی قوت وہ تو کسی سرمایہ کی محتاج نہیں ہے۔ انسان اُسی کے ذریعہ سے طلب معاش کر سکتا ہے۔ چنانچہ زرارہ کی روایت ہے ان رجلا اتی ابا عبد اللہؑ فقال انی لا احسن ان اعمل عملا بیدی ولا احسن ان اتجر وانا محارف محتاج "ایک شخص امام جعفر صادقؑ کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ مجھے کوئی کام نہیں آتا اور تجارت کا بھی سلیقہ نہیں بالکل فقیر و محتاج اور عاجز ہوں پھر اب کیا کروں؟ امام نے فرمایا اعمل فاحمل علی راسک واستغن عن الناس فان رسول اللہؐ قد حمل حجرا علی عنقہ فوضعہ فی

حائط من حیطانہ ہو بیکار نہ رہو' کچھ نہیں تو اپنے سر پر اسباب ڈھو کر مزدوری کرو اور اس طرح لوگوں سے استغنا حاصل کرو اور یہ کوئی ذلت کی بات نہیں ہے۔ رسالتمآبؐ اپنی گردن پر پتھر اُٹھا کرلے گئے ہیں اور باغ میں رکھا ہے۔ اس سے۔

چوتھے خیال کا دفعیہ بھی ہوگیا، جو اکثر ذہنیتوں میں پایا جاتا ہے کہ تجارت جب تک کسی اعلیٰ پیمانہ پر نہ ہو وہ انسان کی حقارت کا باعث ہے اور یہ کہ مزدوری و پیشہ وری، انسان کی ذلت کا سبب ہے۔ درحقیقت یہ افسوسناک خیال وہ ہے جو عام طور پر ہماری قوم کے افراد کے لیے تجارت و پیشہ وری میں سدراہ ہوگیا ہے۔ ہماری قوم میں پیشہ ور ذلیل نظروں سے دیکھا جاتا ہے اور مزدوری کرنے والا پست درجہ کا شخص سمجھا جاتا ہے۔ جب تک یہ خیال راسخ ہے اور سفید پوش طبقہ ان چیزوں کو ذلت کی نظر سے دیکھتا ہے۔ اُس وقت تک کسی قسم کی کامیابی ہونا مشکل ہے کیونکہ اس افلاس و پریشان حالی کے عالم میں جو عام وبائی صورت سے افراد قوم میں پھیلی ہوئی ہے یہ توقع تو کی نہیں جاسکتی کہ ہر شخص کوئی بڑا کارخانہ یا ایجنسی یا کمپنی قائم کرسکتا ہے جو باعزت نظر سے دیکھا جائے ابھی تو جو صورت ممکن ہے وہ یہی کہ ہر شخص اپنی بساط کے مطابق معمولی سرمایہ سے ایک کام کو شروع کرے پھر جب وہ سمجھتا ہے کہ جس دن میں نے ایسا کیا اس دن سے میری جو بھی موجودہ عزت ہے وہ خاک میں مل جائے گی جو لوگ آج سلام کرتے ہیں وہ منھ دیکر بات نہ کریں گے تو بھلا وہ کاہے کو قدم آگے بڑھاتے لگا نتیجہ صاف ظاہر ہے کہ نکبت و افلاس میں

زیادتی ہوتی جائے اور قوم کا مرض ترقی کرتے کرتے ایک دن اُس کو گوشہ قبر میں پہونچا دے۔

یہی ذہنیت وہ تھی جس کے بدلنے کے لیے ائمہ معصومین علیہم السلام نے اپنے طرز عمل کے نمونے دکھلائے۔ حضرت رسولؐ کی سیرت سے نظیریں پیش کیں اس لیے کہ دنیا میں کوئی کتنی ہی عزت حاصل کرے لیکن اگر وہ مسلمان ہے تو اپنے رسولؐ کی عزت کے مقابلہ کا دعوےٰ نہیں کرسکتا عالم امکان کی یہی عظیم ہستی جس کی عزت کے مقابلہ میں دنیا کی عزتیں خاک سیاہ ہیں۔ ہم کو مزدوری کرتے نظر آرہی ہے تو اب دنیا میں کون ہوسکتا ہے جو اپنی عزت کے گھمنڈ پر مزدوری کو اپنے لیے عار و ننگ سمجھے۔

اگر ائمہ معصومینؑ کی سیرت پر نظر کیجیئے تو معلوم ہو گا کہ وہ بلند آواز سے اعلان کر رہے ہیں کہ پیشہ ور افراد کو ذلیل نظر سے نہ دیکھو، صنعت و حرفت، تجارت، مزدوری کو حقارت کا باعث نہ سمجھو۔ وہ لوگ جو پیشہ ور لوگوں کو ذلیل نظر سے دیکھتے ہیں اگر غور کریں تو حقیقۃً انبیاؑ کو ذلت کی نظر سے دیکھتے ہیں۔ ائمہ معصومینؑ کو بہ نظر حقارت دیکھتے ہیں۔ اس لیے کہ وہ سب محنت مزدوری کرتے تھے۔ اگر اُن کی عظمت کا دل پر اثر اور اُن کی عزت کا لحاظ ہے۔ تو پیشہ وری ذلیل نظر سے دیکھے جانے کی مستحق نہیں ہے۔

# سابقہ بیانات کے متعلق پیدا شدہ سوالات کا حل

**قناعت اور اس کا مفہوم۔** مذکورہ حقائق کے مقابلہ میں جو سوالات پیش ہوئے ہیں اُن میں سے پہلا یہ ہے کہ قناعت کیا چیز ہے اور وہ کہاں تک کسب معاش کے سلسلہ میں انسان کے لیے ضروری ہے اور کیا طلب معاش میں سعی و کوشش قناعت کے خلاف نہیں ہے؟

قناعت کے مفہوم پر جہاں تک غور کیا جاتا ہے۔ اُس کے دو شعبے ہیں، ایک قناعت فی الطلب اور دوسرے قناعت فی المصرف، کیونکہ انسان کی زندگی بھی بہ اعتبار اموال دنیا کے ان ہی دو دوروں میں منقسم ہے۔ ایک دور اموال کے جمع کرنے کا اور دوسرا دور صرف کرنے کا اور ان دونوں شعبوں میں قناعت کا عنصر کارفرما ہے۔" پہلا یعنی قناعت فی الطلب یہ ہے کہ انسان جو کچھ اُس کی ذاتی محنت و مشقت، کدو کاوش سے اُس کو دستیاب ہو اور گاڑھی کمائی کا جو کچھ روپیہ اُس کو ملے کم یا زیادہ اُسی پر راضی و خوشنود ہو کر شکر خدا ادا کرے اور دوسروں کے اموال کو للچائی نظروں سے نہ دیکھے کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس کے ہاتھ آجائیں مثلاً انسان نے دوکان لگائی اور دن بھر دوکان میں بیٹھا جو کچھ خدا کو منظور تھا اُتنی آمدنی اُس کو حاصل ہوئی۔ مزدور صبح سویرے مزدوری کرنے باہر نکلا اور اپنی ذاتی مشقت و زحمت سے دن بھر کام کیا اور جتنا منظور الٰہی تھا اُتنا اُس کے ہاتھ آیا، صناع صنعت و حرفت کے آلات لے کر بازار گیا اور جتنے کی مزدوری

لگنا تھی اُتنے کی لگی اور گھر واپس ہوا۔ تو یہی آمدنی جو اُس کو اپنی محنت مزدوری سے حاصل ہوئی ہے اُسی کو وہ اپنے لیے سلطنت ہفت اقلیم کے برابر سمجھے بیشک اُس کو حق ہے کہ دوسرے دن اگر اُس کے لیے وسیع ذرائع مہیا ہوں تو اُن ذرائع کو عمل میں لائے اور کوشش کرے لیکن نتیجہ کو اُس کے پھر بھی خدا کے سپرد کرتے ہوئے صبر و سکون کے ساتھ اُس کے استقبال پر تیار رہو۔

یہ نہیں کہ جو کچھ اپنے ہاتھ آیا۔ وہ آیا لیکن نیت نہیں بھرتی دوسروں کے ہاتھ میں جو اموال ہیں اُن کی طرف بھی حرص و آز کی نظریں پڑ رہی ہیں اور یہ فکر ہے کہ کسی نہ کسی طرح اُن پر قبضہ ہو اُس کے لیے اگر ضرورت پڑی تو دست سوال اور موقع ہوا تو دست تعدی دراز کیا اور اُس کو حاصل کیا۔ یہ ہے وہ طمع و حرص جو انسانی جذبات میں سیلاب کا حکم رکھتی ہے۔ اور وہ پیدا ہونے کے بعد کسی حد محدود تک ٹھہرنا نہیں جانتی اس لیے کہ خدا کی نعمت لامحدود اور انسانی افراد کا تفرقہ اُسی میں لا انتہا ہے۔ انسان اگر جذبہ حرص رکھتا ہے تو وہ کبھی ختم نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ جتنی بھی کوشش کرے خدا کی تمام خدائی اُس کے قبضہ میں نہ آئے گی لہٰذا وہ جتنا بھی مالدار اور صاحب ثروت و اقتدار ہو جائے ہمیشہ بھوکا ہے اس لیے کہ اُس کی نیت سیر نہیں ہوئی، برخلاف اُس شخص کے جو جوہر قناعت کو اپنے پاس لیے ہوئے ہے۔ وہ جد و جہد کرتا ہے اور کوشش و کاوش کی جائز حدود کو ختم کرتا ہے لیکن اس کے بعد جو کچھ اُس کو مل جاتا ہے بس اُس کو وہ اپنے لیے کافی سمجھتا ہے اور اُس کی سیر چشمی اُس کو آگے نظر اٹھا کر دیکھنے کی دعوت نہیں دیتی اور اب اگر شوکت شاہانہ بھی سامنے ہو

اور دولت قارون بھی پیش پا ہو تو وہ اُسے اپنے پے ننگ سمجھتا ہے۔ یہی چیز وہ ہے جس کے متعلق امیر المومنین نے نہج البلاغہ میں ارشاد فرمایا ہے۔

من اراد الغنی بغیر مال فخلیہ بالقناعۃ "جو بغیر مال و دولت کے غنی و تونگر بننا چاہتا ہے وہ قناعت اختیار کرے۔"

اس قناعت کی مختصر تعبیر یہ ہے کہ ھو الکف عما فی ایدی الناس "وہ دوسروں کے ہاتھ میں جو اموال ہیں اُن سے ہاتھ روکے رہنے کا نام ہے" اس طرح بھی کہ دست سوال دراز نہ کرے جو خفاتِ طبع اور پستی فطرت کا نتیجہ ہے اور اس طرح بھی کہ دست تعدی دراز نہ کرے جو شقاوت و قساوت، حق کشی اور ناحق کوشی کا نتیجہ ہوتا ہے، اسی کی دوسری لفظیں یہ ہیں، کہ ھو الرضا بالقسم وہ اپنی قسمت کے حصہ اور نصیب پر رضامندی کا نام ہے، لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ انسان اپنے ذاتی ذرائع و اسباب اور محنت و مشقت کو بھی صرف نہ کرے اس لیے کہ اس صورت میں تو جو قسمت کا حصہ اور نصیب تھا اُس کے ملنے کی بھی اس کو توقع نہیں کیونکہ میں ثابت کر چکا ہوں کہ وہ ذاتی محنت و مشقت اور اسباب و ذرائع کے مہیا کرنے کے ساتھ مشروط ہے اور اس بنا پر درحقیقت اپنے طاقت و مقدور کے مطابق اسباب و ذرائع صرف کرنے سے پہلے قناعت کا محل استعمال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ ابھی اندازہ ہی نہیں ہو سکتا کہ مقسوم الٰہی اس کی نسبت کیا ہے، اصل قناعت کا محل استعمال اُس وقت پیدا ہوتا ہے کہ جب اسباب و ذرائع ذاتی کے صرف کے بعد ایک نتیجہ پر پہونچ جائے۔ بیشک اب قناعت کا موقع ہے، اور اس وقت

قناعت اکتساب و اصلح اور انسان کی شان خودداری و بلند ہمتی کے لیے موزوں و شایان بھی ہے۔

دوسری چیز قناعت فی المصرف ہے اس کے معنی روزمرہ کی اردو زبان میں یہ سمجھنا چاہئیں کہ جتنی چادر ہو اُتنا پیر پھیلائے" یعنی انسان اپنی آمدنی اور ضروریات زندگی میں توازن کو قائم رکھے جتنی انسان کی بساط ہو اُتنا ہی صرف بھی کرے۔ اور اُس سے زیادہ کا طالب نہ ہو یہ قناعت وہ ہے جس کی حضرت سلمانؓ نے تعلیم دی تھی جب اُنھوں نے حضرت ابوذر غفاری کی دعوت کی اور سوکھی روٹی سامنے پیش کی جناب ابوذر کی زبان سے کہیں نکل گیا کہ اس کے ساتھ نمک بھی ہوتا تو بہت اچھا تھا۔ یہ سُن کر حضرت سلمانؓ فرائض میزبانی کی نگہداشت اور مہمان کی خاطرداری کے لیے گئے۔ اپنا آفتابہ رہن کیا اور نمک خرید کر لائے غذا کے تناول کے بعد حضرت ابوذر نے کہا الحمد للہ الذی جعلنا من القانعین شکر ہے اُس خدا کا جس نے ہم کو قناعت گذار قرار دیا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت سلمانؓ نے منھ پر ہاتھ رکھدیا اور کہا کہ یہ نہ کہو اگر قناعت گذار ہی ہوتے تو اس آفتابہ کے رہن کی نوبت نہ آتی۔ ظاہری صورت سے واقعہ بالکل معمولی ہے اور نمک کا معاملہ ہے لیکن درحقیقت اس کے ضمن میں ایک عظیم تعلیم مضمر ہے اور وہ یہی، کہ انسان کو بس جتنا موجود ہے اس میں اپنے ضروریات کو محدود رکھنا چاہیے۔ اور نمک کی بھی ضرورت ہو تو اُس کو قرض، عاریت، رہن وغیرہ عارضی ذرایع سے حاصل نہ کرے۔

حقیقۃً یہ قناعت وہ ہے جس کا نہ ہونا مسلمانوں کا ایک مستقل اور بہت بڑا

مرض ہے جس کے لیے خاص طور سے روشنی ڈالنے کی ضرورت ہے اور جس نے مسلمانوں کو یہ روز بد دیکھنا نصیب کیا ہے۔

ایک مسلمان کبھی اپنی آمدنی و خرچ کا توازن نہیں قائم رکھتا حیثیت معمولی اور مصارف امیرانہ، اچھے سے اچھا لباس، اچھے سے اچھی غذا اور اگر کہیں کوئی تقریب ہوگئی جیسے شادی، زچہ خانہ، بچہ کا عقیقہ یا ختنہ وغیرہ تو پھر تو روپیہ کے وارے نیارے، وہ اولوالعزمی کہ العظمۃ للہ، حیثیت دس روپیہ ماہوار کی بھی نہیں لیکن شادی میں ہزاروں روپیہ بیکار کے رسوم میں صرف کردیئے پھر آئیں کہاں سے؟ سودی روپیہ لیکر، مکان زمین رہن کرکے نتیجہ کیا ہوا کہ آج شادی ہوئی خانہ آبادی لیکن کل وہ شادی ناشادی اور آبادی بربادی بن گئی سود بڑھتے بڑھتے اصل کے برابر یا اُس سے بھی دونا چوگنا ہوگیا مہاجن نے دعویٰ کیا اور جو کچھ مال منقولہ غیر منقولہ تھا اب اُس کی نذر ہوا اور بعض اوقات نتیجہ وارنٹ اور گرفتاری تک پہونچا، یہ سب نتیجہ کاہے کا ہے؟ آمدنی و خرچ میں توازن نہ رکھنے اور اپنی حیثیت کو خیال نہ کرنے اور اُس قناعت پر عمل نہ رکھنے کا جس کو انسان کے لیے ہر وقت اپنا نصب العین رکھنا ضروری ہے۔

یہ قناعت کے معنی ہیں نہ یہ کہ انسان ذرائع کسب معاش کو چھوڑ بیٹھے اور کسب حلال نہ کرے بلکہ عاجز و درماندہ فقر و فاقہ کی حالت میں ساکت و خاموش بیٹھا رہے۔

## الدنیا زور لا یحصل الا بالزور

اس حدیث شریف کے متعلق یہ سوال ہے کہ اُس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیا

صرف مکر و فریب ہے اور بغیر مکر و فریب حاصل نہیں ہو سکتی لہٰذا طلب دنیا کہ جس پر سابقہ بیانات میں زور دیا گیا ہے وہ جائز کیونکر ہو سکتی ہے؟

لیکن حقیقۃً یہ سوال ہمارے سابقہ بیانات پر غور کرنے میں فرد گذاشت کا نتیجہ ہے۔ ہم نے طلب دنیا کے روشن اور تاریک دونوں ہی پہلو پیش کیے ہیں اور اس میں کوئی شبہہ نہیں کہ کوئی حکم جو کسی شے کے متعلق بتلایا جائے وہ اُس شے سے متضاد نہیں ہو سکتا۔ مثلاً یہ کہنا کہ بیمار صحیح ہے، سفید سیاہ ہے۔ متحرک ساکن ہے، خاموش گویا ہے۔ خشک تر ہے۔ گرم سرد ہے، وغیرہ وغیرہ غلط ہو گا اس لیے کہ جب بیمار کو بیمار مان لیا تو اس کو صحیح کہنے کے کوئی معنی نہیں سفید کو سفید کہہ دیا تو سیاہ نہیں اور وہ شے کہ جو متحرک ہے، ساکن نہیں اور خاموش گویا نہیں۔ اور خشک تر، گرم سرد نہیں ہو سکتا کیونکہ متضاد اوصاف ہیں جو قابل اجتماع نہیں ہیں۔

طلب دنیا جس کو میں نے اسلامی تعلیم کا جزو بتلایا ہے وہ طلب حلال ہے اور کسب جائز کا نام ہے اور یہ ظاہر ہے کہ مکر و فریب عام مواقع کے اوپر حلال و جائز نہیں بلکہ ناجائز و حرام ہی ہے۔ تو اب اگر متذکرہ بالا حدیث میں دنیا سے مراد بھی طلب حلال و کسب جائز ہو تو اس کے معنی یہ ہوں گے کہ طلب حلال حرام ہے اور بغیر ذرائع حرام کے حاصل نہیں ہو سکتا یہ جملہ ویسا ہی ہے جیسے سفید سیاہ اور خشک تر ہے وغیرہ وغیرہ،

لہٰذا بہ مناسبت حکم یہ یقین ہے کہ دنیا سے مراد وہی دنیا ہے جس کی انتہائی تاریک تصویر میں سابق میں پیش کر چکا ہوں۔ اس سے صرف یہی حدیثا

نہیں بلکہ اس کے ایسے جتنے احادیث مذمت دنیا میں وارد ہوئے ہیں جن کی کمی نہیں بلکہ کتب احادیث واخلاق اُن سے چھلک رہے ہیں اُن سب کی حقیقت واضح ہوجاتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ اُن کو ذرائع حلال کے واسطہ سے طلب معیشت کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔

**الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر** اس حدیث سے بھی یہ توہم پیدا ہوتا ہے کہ جب معصوم کا ارشاد ہے کہ دنیا مومن کے لیے قید خانہ اور کافر کے لیے بہشت ہے تو اب جو شخص ایمان کے درجہ پر فائز ہو اس کو تو اس دنیا میں کسی راحت وآرام کی توقع ہی نہ کرنا چاہیے اور اُسی زندگی کے لیے تیار رہے جو قیدیوں کے لیے ہوا کرتی ہے لہذا طلب معیشت وکسب دنیا میں کوشش سب بیکار ہے، یہ وہ خیال ہے جو حدیث کے ظاہری الفاظ سے پیدا ہوتا ہے لیکن امام علیہ السلام نے حدیث کے صحیح معنی بیان فرما کر اس خیال کو بالکل غلط کر دیا ہے۔ وہ موقع جب امام رضاؑ حشم وخدم کے ساتھ ایک راستہ سے گذر فرما رہے تھے۔ اور راستہ میں ایک یہودی فقر وفاقہ کی مصیبت میں گرفتار مرض میں مبتلا گلی میں پڑا ہوا تھا، اُس یہودی نے امام کو اس شان وشوکت سے دیکھ کر حضرت کو اپنے قریب بلایا اور کہا کہ دیکھیے میں اس وقت آپ کے نانا کے قول کو غلط ثابت کرتا ہوں، اُن کا قول ہے کہ الدنیا سجن المومن وجنۃ الکافر اور یہ ظاہر ہے کہ آپ بموجب عقیدۂ اسلام مومن اور میں کافر ہوں لیکن آپ اس وقت بہتر سے بہتر حال میں اور میں بدسے بدتر حالت میں ہوں۔

السلام نے فرمایا کہ تم قول رسولؐ کا مطلب صحیح نہیں سمجھے، بیشک دنیا مومن کے لئے قید خانہ ہے اور کافر کے لیے بہشت مگر اُس کے معنی یہ ہیں کہ مومن کے لیے آخرت میں ایسی ایسی نعمتیں ہیں کہ وہ ان کے مقابل میں اگر دنیا کو دیکھے تو وہ اپنی تمام زیب وزینت سمیت قید خانہ معلوم ہوگی اور کافر کے لیے آخرت میں وہ سخت ترین عذاب ہیں کہ وہ اُن کے مقابل میں دنیا کو دیکھے تو وہ اپنے تمام تکالیف ومصائب سمیت بہشت معلوم ہوگی۔ اس کے یہ معنی نہیں کہ مومن کے لیے راحت واکرام اور کافر کے لیے مصیبت وتکلیف کا ہونا اس دنیا میں بالکل ناممکن اور غیر قابل وقوع ہے۔

## کسب معیشت کا وسیع مفہوم

سابقہ بیانات سے میرا جو کچھ بھی مقصد ہے اور اسلامی تعلیمات نے جو کچھ بھی ثابت کرنا چاہتا تھا۔ وہ یہ کہ انسان کو بیکار نہ رہنا چاہیئے بلکہ اپنی ذاتی محنت ومشقت سے اپنی بسر زندگی کا سامان کرے اور اپنے اہل وعیال کا آذوقہ مہیا کرے اور اگر قوت وطاقت وفا کرے تو اس سے زیادہ حاصل کرکے بندگان خدا کو فائدہ پہونچائے قومی ومذہبی کاموں میں صرف کرے اور اس طرح دنیا کو تمہید آخرت بناکر دنیا وآخرت دونوں کا مالک ہو یہی ہے کسب معیشت اور طلب حلال کا مفہوم اس کے وسائل وذرائع کسی خاص صورت میں محدود نہیں ہیں اور نہ اُن کے لیے یہی ضرورت ہے کہ انسان دوکان رکھے اور کسی چیز کی خرید وفروخت ہی کرے جس کی

وجہ سے ایک طرف یہ خیال پیدا ہو رہا ہے کہ آج کل تجارت میں فائدہ مفقود ہوگیا ہے۔ جو لوگ اس شعبہ میں عمریں گذار چکے ہیں وہ بھی اب ان مشکلات سے عاجز و حیران نظر آرہے ہیں۔ جو اُن کو پیش آتی ہیں۔ اور عام طور سے کساد بازاری نے اُن کو فنا کے درجہ تک پہونچا دیا ہے دوسری طرف اکثر وہ افراد جو درحقیقت کسب معیشت کے طریقہ پر عملی طور سے قائم ہیں۔ وہ بھی کسب معیشت کے معنی دوکان رکھنے میں ہی۔ محدود سمجھکر اپنے طرز عمل کی تبدیلی پر غور کر رہے ہیں۔ اس لیے اس امر کا واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کسب معاش کا مفہوم اتنا محدود نہیں ہے۔ جیساکہ خیال کیا جارہا ہے۔ کسب معاش کا مفہوم وسیع ہے۔

اپنی ذاتی محنت و مشقت کے معاوضہ میں سامان زندگی فراہم کرنا اس کی صورتیں مختلف ہیں ایک صناع جو اپنی صنعت و حرفت سے روپیہ کماتا ہے۔ ایک معمار۔ نجار۔ بیلدار مزدور جو دن بھر کام کرتا ہے اور اُجرت لیتا ہے۔ ایک انشاپرداز جو اپنے قلمی خدمات کے ذریعہ سے زندگی گذارتا ہے ایک مدرس جو جائز علوم کی تعلیم کے سلسلہ میں کسی کالج اسکول مدرسہ سے تعلق رکھتا ہے۔ ایک طبیب جو حدود شرع کے اندر طبابت کی فیس لیکر بسر اوقات کرتا ہے یہ سب ہی کسب معاش اور طلب حلال کے فریضہ پر عملدرآمد کرنے والے ہیں۔ اور ان کا طرز عمل کسی حیثیت سے قابل اعتراض نہیں ہے۔

**تقسیم عمل کی بنا پر طریق کار میں اختلاف** یقیناً تقسیم عمل کے اصول پر

نظام اجتماعی کے لیے یہ صورت ممکن نہیں ہے کہ سب ہی افراد دوکان کھولیں اور تجارت شروع کر دیں اس لیے کہ اس صورت میں اہم قومی و مذہبی و اجتماعی کاروبار بند ہو جائیں گے اور نظام اجتماعی درست نہ ہوگا لہذا ہر شخص کو اپنے فرائض و حیثیات پر نظر کرتے ہوئے خود اپنے مناسب حال طریق کار کے تجویز کرنے کا حق ہے جس کے بعد اس سوال کا موقع نہیں ہے کہ تم تجارت ہی کیوں نہیں کرتے؟ یقیناً جس طرح قوم میں ضرورت ہے کہ ایک طبقہ تجار کا ہو اسی طرح ضرورت ہے کہ مثلاً ایک طبقہ اطبار کا ہو، ایک طبقہ اہل صنعت و حرفت و دستکار لوگوں کا ہو، ایک طبقہ واعظین کا ہو ایک طبقہ علمار کا ہو وغیرہ وغیرہ تاکہ نظام نوعی کی تمام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں بیشک ان میں سے ہر طبقہ کو جہاں تک موقع ہو اپنے مناسب حال کسب معیشت کے طریقہ کو اختیار کرنا چاہیے لیکن ضروری نہیں کہ وہ تجارت یا دوکانداری ہی ہو، جناب رسالتمآبؐ نے قبل بعثت اموال خدیجہ کی تجارت فرمائی بعد بعثت تبلیغی ضرورتیں اور نبوت و رسالت کے فرائض اتنے اہم تھے کہ اب اگر قائم و دائم طریقہ سے وہی سلسلہ قائم رہتا تو حضرت کے لیے ان فرائض کا پورا کرنا ناممکن تھا لہذا حضرت کی سیرت میں اس کے بعد مستمر طریقہ سے تجارت پر عملدرآمد نظر نہیں آتا اور اسی طرح ائمہ معصومین علیہم السلام کی سیرت میں بھی ایسا نہیں ہے کہ انھوں نے اپنی عمر ہی تجارت میں گذاری ہو اور دوکان پر بیٹھے ہوئے زندگی ختم کی ہو، اس لیے کہ ان کے فرائض اس سے مانع تھے بس اتنا ہے کہ انھوں نے یہ دکھلانے کے لیے کہ تجارت عار و ننگ نہیں ہے اور تعلیم دینے کی غرض سے

کبھی کبھی یہ صورتیں بھی اختیار کرکے دکھا دیں چنانچہ رسالت مآب کے متعلق ایک دفعہ کا تذکرہ جو نبوت کے بعد کا ہے سابقاً ہو چکا ہے جس کو امام جعفر صادق نے اپنی حدیث میں ذکر فرمایا ہے کہ ان رسول اللہ اشتری عیراً اتت من الشام فاستفضل فیہا ما قضیٰ دینہ وقسم فی قرابتہ "رسالتمآب نے شام سے ایک تجار کا قافلہ آیا تھا اس کے مال کو خرید فرما کر تجارت کی اور جو نفع حاصل ہوا اُس سے اپنے قرض ادا کیے اور اپنے اعزا کی خبر گیری کی، اور یہی صورت ائمہ معصومین علیہم السلام کی ہے۔

علمائے ملت اگر تجارت اور صنعت و حرفت وغیرہ کو ننگ و عار سمجھیں اور حقارت و توہین کی نظر سے دیکھیں تو بیشک قابل اعتراض اور تعلیمات اسلامی کے بالکل خلاف ہے لیکن اگر وہ تجارت کو بہ نظر استحسان دیکھتے ہوئے خود اپنے فرائض کی بنا پر اس کو بطور پیشہ اختیار نہ کریں اور دوسرے جائز و مستحسن ذرائع سے اپنے کسب معیشت کا سامان کریں تو اس اعتراض کا کوئی حق نہیں ہے کہ علماء تجارت کیوں نہیں کرتے؟

## علمائے ملت اور واعظین کا فرض

بیشک علماء و واعظین پر یہ فرض ضرور عائد ہوتا ہے کہ وہ اپنے ہدایات و بیانات سے قوم کی ذہنیت کو تبدیل کرنے کی کوشش کریں اور جو غلط خیالات راسخ ہو گئے ہیں اُن کی کمزوری کو واضح کریں اور اس ذہنیت کو تبدیل کرنے میں اگر کسی اقدام عمل کی ضرورت ہو تو اُس سے بھی دریغ نہ کریں اس لیے کہ یہ غلط خیالات وہ ہیں جو قوم کو

تنزل ... کر اُس عمیق گڑھے میں لے جا رہے ہیں جس سے اُبھرنا دشوار نہیں بلکہ ناممکن ہوگا۔

## صورت عمل یا طریق علاج

اس کے لئے ضرورت ہے کہ قوم کے افراد کو اپنی کمزوری کا احساس ہو اور وہ اس کے تدارک کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ ہماری قوم میں انجمن سازی کا شوق ہے مگر اتنا اہم کام اور وہ اب تک کسی انجمن کے خدمات سے محروم، ضرورت ہے کہ ہر ہر محلہ میں انجمنیں قائم ہوں خطبا و واعظین سے قوم کی اقتصادی تباہی اور تجارت کی اہمیت پر تقریریں کرائی جائیں ایسے شخص کو جو دوکان رکھنا چاہے ہر قسم کی اخلاقی امداد پہونچائی جائے اور اس کی دوکان کو اپنی دوکان سمجھکر اُس کے مفاد کی بہبودی پر نظر ہو۔ جو جذبۂ قومیت کے تحت میں ہونا چاہیے۔ اس لیے کہ اس جذبۂ قومیت کے فقدان کا یہ نتیجہ ہے کہ جو بیچارہ اس سلسلہ میں قدم بھی رکھتا ہے۔ اُس کو دوسرے ہی دن ناکامی کا منھ دیکھنا پڑتا ہے۔ اس لیے کہ ادھر اس نے دوکان رکھی اور احباب و برادران کو خبر ہوئی، دوسرے ہی دن آداب عرض اور سلام علیکم، اپنے سابقہ تعلقات اور قدیمی دوستی و ربط کا پتہ دیتے ہوئے یہ سوال پیش ہوا کہ اتنا قرض دید یجیے اس بیچارے کے مشکلات سے کوئی غرض نہیں کہ ابھی اس کی پونجی کم ہے۔ ابتدائی منزل ہے کتنی دشواریاں پیش ہوں گی اور کیا مشکلات اُس کے سامنے ہوں گے یہ کچھ نہیں اغرض تو اپنے مطلب سے ہے چاہے اُس کا نتیجہ جو کچھ بھی ہو

... اگر اُس نے مروت و دوستی سے مرعوب ہو کر خواہش کو پورا کر دیا تو دوسرے صاحب تشریف لائے اور تیسرے، نتیجہ یہ ہوا کہ دوکان دوستوں کی نذر ہو گئی اور نفع کے عوض نقصان اُٹھانا پڑا اور اگر کہیں اس بیچارے نے اپنی مشکلات پیش کرتے ہوئے عذر کیا۔ تو بس پھر کیا تھا۔ آئینۂ خاطر پر غبار آیا۔ آبگینوں کو ٹھیس لگی۔ اور کہا کہ جب اتنا بھی نہوا تو اپنے ہم قوم سے فائدہ کیا ہم غیروں کی دوکان سے خرید لیں گے۔ اس دوکان سے اب نہ لیں گے۔

یہ نتیجہ ہے قومیت کے نہ ہونے کا اور شخصی مفاد پر قومی ہمدردی کو قربان کر دینے کا انجام یہ ہوا کہ غیروں نے اُس دوکان سے نہ خریدا اپنے احساس قومیت اور اس خیال سے کہ اپنوں کو چھوڑ کر غیروں کے پاس نہ جائیں اور اپنوں نے نہ خریدا اپنے عدم احساس قومیت سے، آخر دوکان ٹوٹ گئی اور جو منظور تھا حاصل نہوا۔ اگر یہ لیل و نہار ہے اور یہی صورت حال تو کامیابی معلوم اور ملت اسلام کو آخری سلام۔ والسلام۔

پبلشر: مرزا حمید حسین حیدر۔ اسسٹنٹ سکریٹری امامیہ مشن۔ نخاس لکھنؤ۔

(مطبوعہ سرفراز قومی پریس لکھنؤ)